نگار

سالانہ چندہ ہندوستان و پاکستان
آٹھ روپیہ چھ آنہ (مع سالنامہ)

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی دس آنہ ۱۰/

تصانیف نیاز فتح پوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ، نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کیے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے اس لیے ضخامت بھی زیادہ ہے۔
قیمت چار روپیہ للعہ/ (علاوہ محصول)

جمالستان

ایڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ، جس میں حسن بیان، ندرت خیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا، ہر افسانہ ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے، اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔
قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے جہ (علاوہ محصول)

من ویزدال

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلیے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے، جس میں مذاہب کی تخلیق دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشائیاں اور پُرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے
قیمت سات روپیہ آٹھ آنے ہجہ (علاوہ محصول)

مجموعہ مذہبی استفسارات و جوابات

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس و ہارون (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) قارون (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) توبہ (۱۵) تعدد ازواج (۱۶) عالم برزخ (۱۷) یاجوج ماجوج (۱۸) ہاروت ماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ ضخامت ۲۲۲ صفحات کاغذ سفید دبیز قیمت جہ

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخی اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور اُن افسانوں کے مطالعہ سے آپ واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے، قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصول)

ترغیبات جنسی یا شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی، نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی، اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا ایڈیشن۔ قیمت چار روپیہ للعہ/

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں (۱) چند گھنٹے فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ (۲) مادیین کا مذہب، نہایت مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت (یکروپیہ (علاوہ محصول)

۵۶ء میں دو خاص نمبر

شایع ہوں گے

ایک "خُدا نمبر" جنوری ۵۶ء میں دوسرا "اُردو نمبر" جولائی ۵۶ء میں۔ ہو سکتا ہے کہ "اُردو نمبر" جنوری میں شایع کیا جائے اور "خُدا نمبر" جولائی میں۔ اس کا فیصلہ قارئین "نگار" پر چھوڑا جاتا ہے۔ "خُدا نمبر" کے بابت بعض تفصیلات آپ کو معلوم ہو چکی ہیں۔ "اُردو نمبر" کے بعض عنوانات یہ ہوں گے:

اُردو زبان ـــ اُردو دکن اور دہلی میں ـ اہلِ دہلی اور اہلِ لکھنؤ ـــ اُردو کے تنزل کے اسباب۔ اُردو کے ارتقائی منازل ـــ اُردو نثر سو سال میں ـــ اُردو ادب کا سماجی پس منظر ـــ ہندوستانی اور اُردو۔ اُردو قومی زبان کی حیثیت سے ۔ وغیرہ

منیجر نگار

پاکستان کے خریدارانِ "نگار"

سالانہ چندہ (۱۰ روپے) ذریعہ منی آرڈر ذیل کے پتہ پر روانہ فرمائیں اور رسید ڈاک خانہ ہمارے پاس لکھنؤ بھیج دیں ۔ ہماری مطبوعات بھی اسی پتہ پر خط و کتابت کرنے سے مل سکتی ہیں :۔

ڈاکٹر ضیاء عبّاس ہاشمی ۔ ۱۰۵، سوبھ راج چیتول روڈ۔ ویسٹ گارڈن ۔ کراچی

اگر ۱۵ تک کسی ماہ کا پرچہ آپ کو نہ ملے

تو اطلاع ملنے پر آیندہ ماہ کے پرچہ کے ساتھ ہم اپنے صرف سے فراہم کر دیں گے لیکن اگر آپ اس سے قبل چاہیں گے تو بیرنگ روانہ ہوگا۔ (کیونکہ مہینے کے اندر اندر پیڈ بھیجنے میں ہم کو چھ گنا محصول ادا کرنا ہوگا) اس لئے جب آپ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع دیں تو یہ ضرور لکھ دیجئے کہ آپ فوراً چاہتے ہیں یا اگلے پرچہ کے ساتھ۔

منیجر نگار لکھنؤ

بعض کمیاب کتابیں

سوانح اُردو

آثار غالب ---- شیخ محمد اکرام --- معہ
غالب ---------- غلام رسول مہر --- معہ
یادگار غالب ---- حالی ---------- معہ
الغزالی ---------- شبلی ---------- سے
تذکرہ کاملانِ رام پور ---------- عہ
تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ---- صہ
مشاہیر عالم طبقۂ حکماء ---------- صہ
الہارون ---------- مصباح الدین --- سے
حیاتِ انیس ---- اشہری ---------- معہ
واقعات انیس ---- احسن ---------- سے
قاموس المشاہیر حصۂ اول ---------- عہ
البرامکہ ---------- عبدالرزاق --- عہ
نورجہاں بیگم ---- اشہری ---------- سے
سیرۃ النعمان ---- شبلی ---------- سے
حیاتِ خسرو ---------- صہ
ہندو ادیب ---- ناظر کاکوری ---- سے

تذکرہ اُردو

گلِ رعنا ---------- عبدالحی ---------- سہ
سخن شعراء فسانہ ---------- صہ عہ
گلشنِ ہند ---- ڈاکٹر زور ---- معہ
آبِ بقا ---------- عشرت ---- للعہ
بہارِ سخن ---------- سندر لال --- صہ عہ
چمنستانِ شعراء --- شفیق ---------- صہ عہ
خطبات گارساں دتاسی ---------- صہ عہ
سراپا سخن ---------- محسن علی ---- عہ
تذکرۂ ہندی ---------- مصحفی ---- عہ
دستور الفصاحت --- یکتا ---------- عہ
پنجاب میں اُردو --- شیرانی ---- عہ

سفرنامے اُردو

حکیم ناصر خسرو ---------- ج

سیر و سیاحت --- ڈاکٹر برنیر --- سہ

ادب اُردو

دیوانِ میر حسن ---------- ع
خمخانۂ عشق ---- امیر مینائی ---- معہ
مراۃ الغیب ---- امیر مینائی ---- ج
کلیاتِ ناسخ ---------- معہ
تاجِ سخن ---------- جلیل ---------- سے
کلیات سودا ---------- سے
دیوانِ مجروح ---------- ج
کلیات تسلیم ---------- صہ
نشتر ---------- یاس عظیم آبادی --- ع
آیاتِ وجدانی ---- یگانہ ---------- سے
کلیات میر ---------- سے
کلیات مومن ---------- سے
دیوان ولی دکنی ---------- صہ
کلیات نظیر / زندگانی بے نظیر --- شہباز ---- صہ
دیوانِ قلق ---------- ج
نقشِ چغتائی ---------- سہ
کلیاتِ نظیر ---------- ج
کلیات تراب ---------- سے

تاریخ اُردو

گنج شائگاں --- تاریخ سکہ جات مصور --- صہ
احسن التواریخ - تاریخ اودھ --- تمنا --- معہ
تاریخ الاسلام --- احسان اللہ --- عہ
آثار الصنادید - پہلا اڈیشن ---------- سہ
تاریخ ڈھاکہ ---- طیش ---------- عہ
صنادید عجم، مہدی حسین، ادب فارسی کی تاریخ .. سے
تاج التواریخ - تین جلد مصور --- نصرت علی --- ضہ
دربار اکبری ---- آزاد ---------- مع

نیچے نگار لکھنؤ

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی
آٹھ روپیہ آٹھ آنے میں وی۔پی ہوگا جس میں

نگار

کہ آپ کا چندہ اکتوبر میں ختم ہوگیا اور نومبر کا "نگار"
سالنامہ ۵۶ء کی قیمت (مع مصارف رجسٹری) بھی شامل ہے

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۶۸ | فہرست مضامین اکتوبر ۵۵ء | شمار ۴

ملاحظات ---------- ۳
نیتشے کی مفکرانہ حیثیت -- پروفیسر ڈاکٹر جعفر حسن -- ۵
ترکوں کے عہد کا ایک رومان --- "ق" ---------- ۱۷
لڑائیوں کی پیشین گوئیاں ---------- ۲۱
نومِ طویل ---------- ۲۵
فنونِ لطیفہ اور علم الاخلاق ---------- ۲۸
نوجوان شاعروں کی ہدایت کے لئے ---------- ۳۱
فنِ تحریر کی تاریخ --- محمد اسحاق صدیقی ---------- ۴۰
گاہے گاہے باز خواں ---------- ۴۵
منظومات - ساقی جاوید۔ فضا ابن فیضی۔ جگیشور ناتھ درما بیتاب۔ پروفیسر شوم شفیق۔ روش صدیقی۔ بسیف۔ نور جہاں نصرت۔ اکرم شفقت ۴۹
مطبوعات موصولہ ---------- ۵۴

ملاحظات

کشمیر چلو ایک نعرہ ہے جو اس وقت پاکستان کی بعض جماعتوں کی طرف سے سننے میں آرہا ہے۔ یہ خیال اول اول اہلِ پاکستان کو گوا کی ستیاگرہ سے پیدا ہوا تھا۔ اس کے بعد جب ہندوستان نے اس تحریک کی مخالفت کی تو انھوں نے اس کی توجیہ یہ کی کہ ہندوستانی حکومت نے کشمیر چلو کی تحریک سے ڈر کر ایسا کیا ہے، حالانکہ اس کا سبب نہ پاکستان کا خوف تھا نہ پرتگالی حکومت کا بلکہ اس کا تعلق بالکل ستیاگرہ کے اصول سے تھا جس کو گوا کے ستیاگرہی سمجھ نہ سکے تھے۔

ستیاگرہ دراصل آزادی و حصولِ آزادی کا نہایت بلند اخلاقی و روحانی عمل ہے، جس میں مقاومت کا جذبہ انتہائی شدید ہوتا ہے، لیکن انتقام کا جذبہ بالکل مفقود۔ ایک سچا ستیاگرہی کبھی کسی پر غصہ نہیں کرتا، لیکن وہ کسی کے غصہ سے ڈرتا بھی نہیں، اس کا مسلک تیغ و سنان سنبھالنا نہیں بلکہ ان کے سامنے اپنا سینہ کھول دینا ہے جو بڑا مشکل کام ہے، کیونکہ غصہ و انتقام دونوں انسان کے فطری جذبے ہیں اور ان کو دبانے کے لئے فطرت سے بڑی جنگ کرنا پڑتی ہے۔

ستیاگرہ کی دوسری شرط یہ ہے کہ اس کا مظاہرہ اُس فریق کے خلاف کیا جائے جس نے کسی قوم کے جایز حقوق غصب کرلئے ہیں۔ گوا میں جاکر ہندوستان کے باشندوں کا ستیاگرہ کرنا اس شرط کے منافی تھا۔ کیونکہ معاملہ گوا کی حکومت اور گوا کے باشندوں کا تھا نہ کہ ہندوستان کے رہنے والوں کا۔ اس لئے ستیاگرہ کا حق صرف گوا کے باشندوں کو تھا اور اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر ہندوستان کی حکومت نے اسکی مخالفت کی۔

اب انھیں باتوں کو سامنے رکھ کر "کشمیر چلو" کی تحریک ستیاگرہ کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ کسی طرح مناسب نہیں ہے،

کیونکہ اول تو مسلمان بہت جلد مشتعل ہوجاتے ہیں اور وہ مشکل ہی سے جذبۂ نفرت و انتقام سے علٰحدہ ہوکر اس تحریک کو چلا سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ زمانہ تک وہ صبر و ضبط سے کام لیں، لیکن ان کا یہ جہاد بالنفس ہر وقت جہاد بالسیف میں تبدیل ہوسکتا ہے اور اس طرح ستیاگرہ کا جنگ کی صورت اختیار کرلینا یقینی ہے۔ ممکن ہے پاکستان کے لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ حکومتِ پاکستان اس تحریک میں ان کا ساتھ دے گی اور اس طرح ان کی ستیاگرہ کامیاب ہوجائے گی۔ لیکن ان کا یہ خیال صحیح نہیں، کیونکہ پاکستانی حکومت کا اس میں حصہ لینا گویا ہندوستان کو لڑائی کا چیلنج دینا ہے اور اس کے لئے غالباً نہ وہ خود طیار ہے نہ بین الاقوامی سیاست اس کی اجازت دے سکتی ہے۔

علاوہ اس کے اگر ستیاگرہ کا حق کسی کو پہونچتا ہے تو وہ صرف کشمیر کی آبادی ہے، نہ کہ پاکستان کی آبادی ۔۔ اگر کشمیری آبادی یہ سمجھتی ہے کہ ہندوستان اس کے حقوق کا غاصب ہے اور اس کو مکمل آزادی ملنا چاہئے تو بے شک اسے ستیاگرہ کا حق پہونچتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر کسی وقت اندرون کشمیر سے ایسی متفقہ آواز بلند ہوئی تو ہندوستان یقیناً اسے آزاد کردے گا۔ لیکن پاکستان کے باشندوں کا کشمیر کی طرف سے ستیہ گرہ شروع کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

کشمیر میں بے شک مسلمانوں کی اکثریت ہے اور اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کرلیں کہ وہ بھارت کے زیر اقتدار رہنا پسند نہیں کرتے تو بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ پاکستان کے زیر اقتدار رہنا پسند کریں گے، ہوسکتا ہے کہ وہ بھارت و پاکستان دونوں سے علٰحدہ ہوکر خود اپنی خود مختارانہ حیثیت علٰحدہ قایم کرنا چاہتے ہوں۔

بہرحال کشمیر چلو کی تحریک ہمارے نزدیک مناسب نہیں کیونکہ پاکستانیوں میں نہ ستیاگرہ کے بارگراں اٹھانے کی اہلیت پائی جاتی ہے نہ انھیں اس کا حق پہونچتا ہے اور اگر انھوں نے محض وقتی جوش کے زیر اثر ایسا کیا تو وہ بالکل وقتی چیز ہوگی اور آخر میں ان کی ناکامی زیادہ رسوائی کا باعث ہوگی۔

گو کشمیر کا فیصلہ سیکورٹی کونسل کے ہاتھ میں دیدیا گیا ہے اور وہ شاید ہی کبھی اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرے لیکن پاکستان اور بھارت دونوں نے اس ولاً رائے عامہ پر اس کا انحصار رکھا ہے اور ہوسکتا ہے کہ کسی وقت کوئی صورت اس کی پیدا ہوجائے۔ لیکن اگر پاکستان تادیر اس کا انتظار نہیں کرسکتا یا کسی باہمی فیصلہ ناممکن ہوجاتا ہے تو پھر اسے دوسرے زاویوں سے بھی سوچنے کا حق حاصل ہے، لیکن وہاں کی پبلک کو غالباً یہ حق کبھی حاصل نہیں ہوسکتا کہ وہ خود بغیر حکومت کی اجازت کے کوئی ایسا قدم اٹھائے جو دونوں ملکوں کے تعلقات خراب کرنے کے علاوہ اور کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرسکتا۔

اس دوران میں پاکستان کے بعض اخبارات نے اس بات میں جو کچھ لکھا ہے اس کے لب و لہجہ کو دیکھ کر ہمیں افسوس ہوا۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان کے بعض اخبارات بھی اس باب میں بہت غیر محتاط ہیں اور ان کا لب و لہجہ واقعی قابلِ ملامت ہے، لیکن گالی کا جواب گالی سے دینا کسی طرح مناسب نہیں۔ اگر بھارت کے اخبارات غیر شریفانہ روش اختیار کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ پاکستانی اخبارات بھی وہی روش اختیار کریں اور سنجیدگی و متانت ہاتھ سے دیدیں۔

پاکستان مسٹر غلام محمد کے بعد مسٹر غلام محمد نے اپنے دوران سیاست میں جو کچھ کیا، وہ اپنی جگہ کسی طرح نامناسب نہ تھا کیونکہ جب تک کسی ملک میں صحیح جمہوری روح پیدا نہ ہو اور جماعتی اختلافات کی وجہ سے حکومت کا شیرازہ منتشر ہو رہا ہو، تو پھر اس کا علاج صرف آمریت ہے یا عسکریت ۔ اور مسٹر غلام محمد کو یہی راہ اختیار کرنا چاہئے تھی لیکن افسوس ہے کہ وہ صحت کی خرابی کی وجہ سے کسی نتیجہ خیز منزل تک نہ پہونچ سکے اور انھیں اس بارِ گراں سے سبکدوش ہونا پڑا۔ تاہم ان کی دانشمندی تھی کہ انھوں نے اپنا جانشین ایک ایسے شخص کو نامزد کیا جو ضرورت کے وقت ایک اچھا ڈکٹیٹر ثابت ہوسکتا ہے۔ اور اگر حالات موافق ہوں تو وہ جمہوریت کو بھی زیادہ مضبوط بنا سکتا ہے۔

نیتشے کی مفکرانہ حیثیت

(پروفیسر ڈاکٹر جعفر حسن حیدرآباد)

نیتشے، پچھلی صدی کا ممتاز مفکر اور ادیب گزرا ہے، جس کے خیالات کی اہمیت، ندرت اور سچائی کے علاوہ ان کی معنویت اور تاثیریت کے کارن ناقابلِ انکار ہے۔

نیتشے کا دل و دماغ کئی قابلیتوں اور صلاحیتوں کا حامل تھا۔ اسے مختلف موضوعوں سے دلچسپی تھی اور ہر ایک میں قابلِ لحاظ دخل تھا۔ اس کی تصنیفوں کا تعلق سیاست اور سماج، موسیقی اور شاعری، تنقید اور تاریخ، اخلاق اور مذہب، فلسفہ اور منطق سے ہے۔ وہ چاہے کسی موضوع پر تبصرہ کر رہا ہو، وہ چاہے کسی عنوان پر خیال آرائی کر رہا ہو، خواہ وہ کسی بات کی کھوج میں لگا ہو، چاہے وہ کسی نکتے کی تحقیق میں مگن ہو اس پر شعریت اور ادبیت ہمیشہ غالب رہی ہے اور وہ ان ہی سے متاثر ہو کر کبھی شاعرانہ نقاد کے بھیس میں، کبھی ادیبانہ مبصر کی شکل میں، کبھی فلسفیانہ ادیب کے روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ گویا نیتشے ادیب یا فلسفی یا شاعر اور نقاد، مفکر اور طنز نگار کا ایسا دلآویز امتزاج ہے کہ بسا اوقات یہ فرق کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ دراصل ادیب ہے یا فلسفی، نقاد ہے کہ طنز نگار، مفکر ہے یا شاعر؟

نیتشے کی دنیوی زندگی کی مختصر سرگزشت یہ ہے کہ وہ ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوا۔ ۲۴ برس کی عمر میں سوئٹزرلینڈ کی بازل یونیورسٹی میں لاطینی اور یونانی کا استاد مقرر ہوا۔ دس بارہ برس ملازمت کی۔ بیماری کی وجہ سے خدمت سے سبکدوش ہو کر اپنی آبائی جایداد، تصنیفی آمدنی اور بہنانہ امداد پر گزر بسر کرتے ہوئے زیادہ تر بیماری کی حالت میں زندگی کے دن کاٹتا رہا، سچ پوچھئے تو اسے بیماریوں کی درمیانی مدت میں یا افاقے کی حالت میں لکھنے پڑھنے کا موقع ملتا تھا اور اسی کو غنیمت جان کر خوب محنت کرتا تھا، آخر کار ذہنی توازن سے محروم ہو کر اور اسی حالت میں تقریباً دس سال اپنی بہن کا مرہونِ احسان رہ کر پچھلی صدی کے آخری سال یعنے ۱۹۰۰ء میں رحلت پائی۔

اگرچہ دنیوی زندگی کے اعتبار سے نیتشے سترہویں صدی سے تعلق رکھتا تھا مگر ذہنی اعتبار سے وہ اپنے زمانہ سے بہت آگے تھا۔ چنانچہ اس کے بہت سے خیالات نہ صرف موجودہ زمانہ سے ہم آہنگ ہیں بلکہ بعض آج کے لئے بھی ناموزوں اور قبل از وقت ہیں۔ ان کی قدر و منزلت کے لئے دنیا کو اور کئی کروٹیں بدلنی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ پچاس ساٹھ یا سو برس کے بعد ان کی صحیح قدر و قیمت معلوم ہو۔

نیتشے کی مفکرانہ اور ادیبانہ حیثیت اس کی اہم تصنیفوں کے ناموں ہی سے ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ

"موسیقی کی روح سے المیے کی پیدائش"

"خوش خیالانہ علم"

"یورپی نہیلیت"

"قدروں کی بازقدری"

"انسانیت دوستی"

اور "اخلاق کی کشمکش"

نیتشے کی چند مشہور تصنیفوں کے مشہور تر نام ہیں۔

نیتشے کی ہر جہتی شخصیت

نیتشے کی ایک ممتاز خصوصیت اس کی ہر جہتی یا کئی نوعی شخصیت تھی۔ لوگوں کو نیتشے کے خیالات اور فلسفہ سے چاہے کتنا ہی اختلاف ہو اس حقیقت سے کسی نے انکار کرنے کی جرأت نہیں کی کہ جرمن زبان پر نیتشے کو پورا عبور حاصل تھا وہ اس زبان میں ایک نئے اور دلآویز سٹائل کا موجد اور اس کا بہترین انشا پرداز تھا اس کی تحریر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ 'لفظوں کی موسیقی اور مصوری' ہے۔ وہ بھی اس اعلا درجے کی ہے کہ ترجمہ بلکہ ترجمہ در ترجمہ ہو کر بھی اس کے دلفریب فقرے اور جملے بادلوں کے بیچ بیچ میں سے جھلکنے والے چاند تاروں کی طرح اٹکھیلیاں کر کے خوش کرتے ہیں۔

نیتشے کے مخالف تاریخ نگار فلسفی فورلینڈر نے اپنی "تاریخ فلسفہ" میں لکھا ہے کہ نیتشے:

"علمی مفکر سے کہیں زیادہ فنون لطیفہ کا صناع ہے"۔

نیتشے کے ایک مخالف نے لکھا ہے کہ:

"نیتشے کی کتابوں میں زبان ہی زبان ہے"۔

اس کا جواب کسی نیتشے پریمی نے ترکی بہ ترکی بلکہ عامیانہ طریقے پر یہ دیا:

"آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی کتابوں میں زبان بھی نہیں!"

نیتشے کی نثر نگاری کے علاوہ ادبیت کے لئے اس سے بہتر اور کیا ثبوت دیا جا سکتا ہے کہ نہ صرف اسکی عمدہ عمدہ نظموں کو بلکہ اس کی نثر کے عمدہ حصّوں کو لوگ زبانی یاد کرتے ہیں، خاص کر اس کی کتاب "یوں کہا زرتشت نے"۔ (

ادبی اعتبار سے ایک لافانی چیز ہے اور یورپی ادب کے بہترین کارناموں میں شمار کئے جانے کی مستحق ہے۔

نیتشے کا کارنامۂ حیات

نیتشے کا کارنامۂ حیات مختلف سماجی علوم کی خدمت گزاری، قدیم زبانوں کی تحقیق اور جرمن ادب میں سحر نگاری ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ نیتشے نے جو پیغام عمل دیا ہے وہ انسانیت کے لئے ایک بیش بہا تحفہ ہے۔

نیتشے مذہب اور مذہبیت خاص کر عیسائی مذہبیت کا سخت ترین مخالف تھا اور مذہبی وجدانیت اور مذہبی عقیدت مندی اور اعتقاد پرستی سے اسے انتہائی بیر تھا، مذہبی تعصب سے پیدا ہونے والے جنون پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے سماجی نفسیات پر روشنی ڈالی ہے۔ خود فلسفے میں وہ جس فکری دبستان کا بانی ہوا اسے 'فلسفۂ فہم عامہ' کہا گیا ہے۔ اس کے نمایاں ترین رجحان۔

"قدروں کی بازقدری" Revaluation of Values

اور "اقتدار کی تڑپ" Will to Power

میں پائے جاتے ہیں۔

ہمیں نیتشے کا فلسفہ بیان کرنا مقصود نہیں۔ مقصود ہوتا بھی تو کسی فلسفی یا فلسفے داں ہی سے یہ بن پڑتا۔ ہمیں تو یہ دکھانا ہے کہ نیتشے کی مفکرانہ حیثیت کیا تھی؟ اس کا تخیلی نظام کیا تھا؟ سورج بجار کے نیتشیانہ مندر میں کون کون سی مورتیاں ہیں؟ ان مورتیوں کی پوجا کیسے ہوتی ہے؟ ان کے پجاری کیا کہتے ہیں؟ نیتشے کے من مندر میں کیا خوبیاں اور خصوصیتیں ہیں؟ ان میں کیوں اتنی کشش اور جاذبیت، دل کشی اور سچائی، حسن اور صداقت، سندرپن اور اچھائی ——— لبھاؤپن اور ہر دلعزیزی ہے؟

فلسفۂ سکھ پسندی

نیتشے کی مفکرانہ حیثیت کا سب سے ممتاز پہلو رجائیت یا سکھ پسندی کی تلقین و تبلیغ اور دکھ پسندی یا قنوطیت کی مخالفت اور تحقیر ہے یہ کس قدر تعجب انگیز بات ہے کہ ایک شخص جس کی آدھی زندگی جسمانی تکلیفوں اور بیماریوں میں گزری ہو زندگی بھر سکھ پسندی کی تبلیغ کرتا رہا۔ اس کی تصنیفوں میں جو عام خصوصیت پائی جاتی ہے وہ یہی سکھ پسندانہ فلسفہ ہے اس کا پرچار نیتشے نے اس شد و مد سے کیا کہ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی اور وہ اسے دنیا پرست، حسیت کا پرستار، نفسانیت زدہ اور جبر و تشدد کا

پجاری سمجھنے لگے مگر واقعہ یہ ہے کہ نیتشے صرف سکھ پسند تھا اور لوگوں کو دنیا کا منور رخ دیکھنے، ہنسی خوشی سے زندگی گزارنے اور اٹل مصیبتوں یا ناگہانی آفتوں اور اتفاقی حادثوں کو ہنس کھیل کر گزارنے کا درس دیتا تھا۔

بار بار نیتشے نے اپنی تمام تحریروں میں ان ہی خیالوں کا پرچار کیا اور مختلف طریقوں سے، مختلف پیرایوں میں، نت نئی مثالیں دے کر بھانت بھانت کی تشبیہوں کے ذریعے ایک سکھ پسند مفکر ہونے کا ثبوت دیا۔

اس کی ابتدا در اصل یوں ہوئی کہ جرمنی کے ایک معروف مفکر ولہم لائبنتس (W. Leibnitz) نے دنیا کو بہترین ثابت کرنے کی کوشش میں یہ تک کہا تھا۔

"ہماری دنیا نہ صرف امکانی حد تک بہترین ہے، بلکہ اس سے بہتر دنیا کا پیدا کرنا ناممکن ہے"

اس کے برخلاف آرتھر شوپن ہاور (A. Schopenhauer) نے دنیا کو بدترین ثابت کرنے کی کوشش میں یہ کہا تھا۔

"دنیوی زندگی ایک ایسا کاروبار ہے جس کے اخراجات زیادہ اور آمدنی کم، لہذا بیکار ہے!"

شوپن ہاوری خیالات پر وہ نظریہ قایم ہوا جسے انسانی السدھارپن کا نظریہ

Theory of Incorrigibility of Man کہتے ہیں۔

اس نظریہ کے مطابق آپ چاہے کچھ کیجئے انسان نہ تو سدھرا ہے اور نہ سدھرے گا۔ بدھ سے لیکر گاندھی تک ان گنت رشیوں منیوں اور گیانیوں نے اہنسا کی تعلیم دی۔ مار پیٹ، خونریزی، قتل اور غارت گری سے منع کیا۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اور نہ جانے کتنے خلیفہ اور امام، گرو اور پنڈت، مجدد اور رہبر، پیر اور ولی، مرشد اور ملا آئے۔ لوگوں کو لڑائی جھگڑوں سے دور رکھنا چاہا، امن اور انصاف، انسانیت اور بھلائی کا پیغام پہونچایا یا ان کی تاویلیں اور تنگ کلیں کیں، معنے مطلب سمجھائے اور تفسیریں پیش کیں۔ مذہب اور مذہبیات سے ہٹ کر خالص دنیاویت کے دائرے میں سقراط سے لے کر ٹالسٹائے تک، کنفوشس سے لے کر لن یوٹانگ تک، کونت سے لے کر برگساں تک بیسیوں اور سیکڑوں نہیں ہزاروں اور لاکھوں فلسفیوں، عالموں اور محققوں نے عدل کے طریقے بتائے، قانونیات کے گر سمجھائے، اخلاق کے درس دئے، "جیو اور جینے دو" کے راز سمجھائے، خدمت اور دوسروں کو فیض دینے کے طریقے بتائے۔ الہامی کیفیتوں اور نظری دبستانوں کو چھوڑئے انسانی تنظیم میں بادشاہی اور شہنشاہی، چناؤ اور وراثت سب کے سب ناکام ہوئے، دیالو خدا راج (Benevolent Despotism) سے لے کر نراج تک، نگری ریاست سے لے کر سامراجی مملکتوں تک، قبیلائی تنظیموں سے لے کر ادارہ اقوام متحدہ تک بیسیوں راج کاجی اور کمیونزم، مارکسزم اور لینزم کی طرح دھن کاجی مسلکوں نے یا فرعونیت اور ہٹلریت کی طرح کئی راکشسی مملکتوں نے جنم لیا، رواج پایا، زور دکھایا اور ناکام ہوئے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ساری کائنات کو فیض پہنچانے والے اصولوں کے مدعی اور مکمل نظام زندگی کی تلقین کرنے والے مذہبوں نے شرافت اور بھلمنساہٹ کا پرچار کیا۔ توریت اور زبور، انجیل اور قرآن، اپنشد اور بھگوت گیتا، گرنتھ صاحب اور زندا وستا، بسوا پران اور مہابھارتھ پر کاش نامی کتابیں نازل ہوئیں اور تو اور بار بار اوتار دھارن کر کے نزولِ اجلالِ خدا بیانہ ہوا، مگر انسانی سرشت نہ بدلنی تھی نہ بدلی۔

خونریزی اور تہمت بازی، سازشیں اور جھوٹ، غلط بیانی اور جھوٹی باتیں، بے وفائی اور ریاکاری، بے ایمانی اور بدنیتی، فریب اور دغا، کاہلی اور جاہلی، عریانی اور بے حیائی، مکاری اور چلتر بازی، خشامد اور بے غیرتی کہاں کہاں تک اور کس کس کا ذکر کیا جائے۔ ہم میں وہ تمام برائیاں اور خامیاں ہیں، وہ تمام خصوصیتیں اور خاصیتیں ہیں جو روز ازل سے اب تک ہمارے ننھیال اور ددھیال میں، ہمارے سمدھیانے اور سسرال میں، ہمارے ساتھیوں اور پڑوسیوں میں، ہمارے بزرگوں اور بچوں میں پائی جاتی تھیں، پائی جاتی ہیں اور غالباً آخری انسانوں تک پائی جائیں گی۔

اگر حافظ نے کہا تھا:

این چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم — ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم
ہیچ رحمی نہ برادر بہ برادر دارد — ہیچ شفقت نہ پدر را بہ پسر می بینم
دختراں را ہمہ جنگ است و جدل با مادر — پسراں را ہمہ بدخواہ پدر می بینم
اسپ تازی شدہ مجروح بہ زیر پالاں — طوق زریں ہمہ در گردنِ خر می بینم

تو ہمارے ہی ملک کے زمانہ شناس شاعر اور فلسفی حالی نے کہا ہے:

مجالس میں غیبت کا زور اس قدر ہے — کہ آلودہ اس خون میں ہر بشر ہے
نہ بھائی کو بھائی سے یاں درگزر ہے — نہ مُلّا کو، صوفی کو اس سے حذر ہے
جنھیں چار پیسے کا مقدور ہے یاں، — سمجھتے نہیں ہیں وہ انساں کو انساں،
موافق نہیں جن سے ایام دوراں — نہیں دیکھ سکتے کسی کو وہ شاداں

فتنے میں تکبر کے ہے چور کوئی
حسد کے مرض میں ہے رنجور کوئی

کسی جرمن پادری نے بڑے فخر سے کہا تھا:

"مذہب خاص کر عیسائی مذہب محبت ہی محبت پر مشتمل ہے، اس کی بنیاد رواداری، انصاف پسندی اور ہم احساسی یا ہمدردی پر قائم ہے۔"

اس قول کا حوالہ دیتے ہوئے شوپن ہاور (Schopenhauer) نے اپنی قابلِ دید کتاب Parerga u. Paralipomena میں خوب لکھا ہے کہ:-

"رواداری اور عفو پسندی بلکہ وجدانیتی پرورش کی تلقین کرنا کیا اسے زیب دے سکتا ہے جو خود نارواداری اور انتقام پسند ہو؟ گواہ کی حیثیت سے میں کلیسائی عدالتوں، صلیبی جنگوں، مذہبی لڑائیوں کو اور برونو اور وانینی کی چتاؤں کو طلب کرتا ہوں۔ ہم صلیبی جنگوں کی درندگی اور ظالمانہ بربریت سے زیادہ واقف نہیں۔ برونو اور وانینی پر جو کچھ بیتی تھی اس سے کبھی مانوس نہیں۔ شوپن ہاوری خیالات کی قدر و قیمت پہچاننے اور انھیں ذہن نشین، دل نشین بلکہ روح نشین کرنے کے لئے ایسے ناموں کا بھی حوالہ دینا ضروری ہے جن سے ہم پہلے ہی سے واقف ہیں اور جو مذہبی اعتقادیت، فرقہ واری مذہب زدگی اور جنونِ فرقائی اعتقاد پرستی کا بے جا نہ شکار ہوئے ہیں۔

اس لئے شوپن ہاوری طنز نگاری سے فایدہ اُٹھاتے اور جملہ دل دادگانِ اقبال، پرستارانِ اقبال، فریفتگانِ اقبال بلکہ خود روحِ اقبال سے مخاطب ہوتے ہوئے میں یہ کہنے کی جسارت کر سکتا ہوں:-

"بجا ہے! چنانچہ اس قول کی شہادت میں کہ:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

میں سقراط اور حضرت عیسیٰ، میرا بائی اور دوشیزۂ ارلیاں، منصور اور گرو گوبند سنگھ، قرۃ العین اور بہاء اللہ کی روحوں کو طلب کرتا ہوں"۔

نہ صرف یہ بلکہ ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ اور پوری سنجیدگی سے شوپن ہاور کی مزید تائید کرتے ہوئے یہ بھی کہہ سکتا ہوں:- "یروشلم کی پہاڑی پر ہتھیلیوں اور ہیڑھیوں میں ٹھونکی ہوئی کیلوں نے، میدانِ کربلا کے تپتے ہوئے ریگستان پر پیاسے گلے

کی کٹتی ہوئی رگوں نے، جمنا کے گھاٹ پر ایک چھلنی کلیجے میں سے آخر وقت تک ٹپکتے ہوئے خون کے قطروں نے یہ شہادت پیش کی کہ دو ہزار سال میں انسان نے کچھ ترقی نہیں کی"۔

غرض اس فضا میں نیتشے نے جنم لیا اور اسی فضا میں اس کی پرورش ہوئی۔ عین اس وقت جب کہ نیتشے کے لڑکپن اور جوانی کا زمانہ تھا شوپن ہاور کی مقبولیت بڑھتی جا رہی تھی اور دُنیا کے فلسفہ پر ہی نہیں بلکہ عام تعلیمیافتہ لوگوں پر اس کا گہرا اثر پڑ رہا تھا۔ جس وقت شوپن ہاور کا انتقال ہوا نیتشے کی عمر صرف ۱۶ سال کی تھی۔ شوپن ہاور مرچکا تھا مگر اس کے خیالات زندہ تھے، وہ قومی ادبار کا زمانہ تھا۔ جرمنی بھانت بھانت کی راج کاجی پریشانیوں میں مبتلا تھا۔ ملک کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ قوم ابتری میں بے حس ہو گئی تھی۔ ان مسئلوں کو حل کرنے کی ظاہرہ کوئی صورت نہیں تھی۔

ایسی حالت میں شوپن ہاور کے دکھ پسندانہ فلسفہ کو پنپنے کے لئے بہت ہی زرخیز اور شاداب زمین ملی۔ لوگوں سے نفرت کرنا، انسانوں کی تحقیر کرنا، زندگی کو بے کار، زندگانی کو بے سود، علم کو فضول، تہذیب کو لغو، کوشش کو ہیچ سمجھنا شوپن ہاور نے سکھایا تھا خُود اس نے اقرار کیا ہے کہ:

"میں انسانوں سے نفرت کرنے والا نہیں، ان کی تحقیر کرنے والا ہوں"۔

جس گہرائی سے شوپن ہاور انسانوں کی تحقیر کرتا تھا اس کا اندازہ اس لفظ سے ہو سکتا ہے جو اس نے انسانوں کے لئے تراشا تھا۔ جس طرح ہم گایوں، بیلوں اور بھینسوں وغیرہ کو ان کی نمایاں ترین جسمانی خصوصیتوں کی بنا پر "چوپایہ" کہتے ہیں، اسی طرح شوپن ہاور انسانوں کو "Vierfüßer" کے قیاس پر "Zweifüßer" یعنے "دوپایہ" کہتا تھا۔ ہزاروں لاکھوں میں جو سچا عاقل اور پکا ایماندار ہے وہ بقول شوپن ہاور "ہزاروں لاکھوں شودروں اور پاریاؤں میں اک برہمن ہے"۔

اسی قسم کی دکھ بھری تلقین اور طرح بھی کی جا رہی تھی۔ جس فضا میں نیتشے کی نشوونما ہو رہی تھی وہاں کالوینیت (Calvinism) قسمت پرستی اور تاریکیت چھائی ہوئی تھی، جو لوگ غیر معمولی قابلیت کے ہوتے ہیں ان پر فضا اور ماحول کا زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس حقیقت کے باوجود کہ نیتشے نے شوپن ہاور کی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا اور ایک طرح اسے اپنا استاد بھی مانتا تھا پھر بھی اس نے اپنے لئے سیدھا راستہ ڈھونڈ نکالا اور لائبنٹس اور شوپن ہاور کے بین بین وہ راستہ اختیار کیا جو افراط اور تفریط سے مبرا، مبالغوں سے دور، اغلبیت سے قریب لہذا حقیقت سے قریب ترین تھا۔

قدرتی طور پر نیتشے کو سب سے پہلے تو یہ خیال آیا ہوگا کہ انسان کے انسدھارپن کا نظریہ جس قدر صحیح ہے، اسی قدر صحیح انسان کے ان برباد پن کا نظریہ Theory of incorruptibility of Man صحیح ہے یا ہو سکتا ہے۔

اس کا تعلق سائنس کے اس مشہور نظریہ سے ہے کہ مادہ ان برباد یعنے کبھی نہ برباد ہو سکنے والا ہے۔ مادہ ہمیشہ اپنی شکل بدلتا ہے، فنا نہیں ہوتا۔ لکڑی جلتی ہے، کوئلا بنتی ہے، کوئلا راکھ ہو جاتا ہے، راکھ ہوا میں منتشر ہو کر کچھ اسی کا جزو ہو جاتی ہے اور کچھ زمین میں گھل مل کر جزو غذا یا پھول کا جز بن کر کسی حسینہ کی ذات یا اس کا سنگھار بنتی ہے۔

اسی قیاس پر یہ سمجھ لیجئے کہ انسان کی اچھی خصوصیتیں کبھی برباد نہیں ہو سکتیں۔ رحم دلی، انصاف پسندی، شرافت، علم دوستی، وفاداری، بے غرضی، خدا ترسی، خُدداری اور خُدفراموشی جیسی نیکیاں انسانی سیرت و کردار کی بیسیوں برائیوں کی طرح کبھی فنا یا مفقود نہیں ہوں گی۔

انسانی سیرت سے متعلق انسدھارپن کا نظریہ جس قدر صحیح ہے اسی قدر ان برباد پن کا نظریہ بھی صحیح ہے۔ لاکھوں پیغمبروں، اوتاروں ولیوں، رشیوں، منیوں اور فلسفیوں کو انسانی رذالت کے دور کرنے میں ناکامی ہوئی تو شیطان بھی تمام انسانوں کا بہکا نہ سکا اور نہ نفس کو بلا استثنا ہر دور میں سو فی سیکڑہ کامیابی ہوئی۔ یاجوج اور ماجوج، ابلیس اور راکشس، دجال اور راون بدھا جیسے

رہنماؤں، سرمد جیسے صوفیوں، کے سے بی ان کا (Casablanca) جیسے فرض شناسوں، ہریشچندر جیسے ست دھرمیوں اور سیتا جیسی پارساؤں کو ہر قسم کی دھمکیوں اور ترغیبوں کے باوجود بہکا نہ سکے۔ میر جعفر اور میر صادق کے توڑ پر عبدالرزاق لاری، قلی بیلارہ اور ملکہ کیتھرین یا ماریا انتونیت اور مادام دیمپادور کی زد میں پدمنی اور جھانسی کی رانی، تیمور اور ہلاکو، نادر شاہ اور نپولین کے برعکس اشوک اعظم، مدام دباری اور ماما جمیلہ کے جواب میں چاند بی بی یا روپا متی، یزید کے توڑ پر حسین، کوزلنگ جیسے رسوائے زمانہ جرات فروشوں کے برعکس ٹیپو سلطان جیسے سرفروش، بچہ سقہ جیسے غنڈوں کے جواب میں رابن ہڈ اور تانتیا ٹوپی جیسے دیالو اور شریف رہزن۔ ان گنت کیوتوں کے جواب میں بھرت جیسے سپوت، ہر فرعونی راموسی کے مشہور قول کے مطابق ہر ملک کے ہر دور میں رہے ہیں۔ بابر جیسا باپ، ونڈسر جیسے پریمی، شاہجہاں جیسے شوہر، دروپدی جیسی بہو، علی جیسے داماد، ساوتری کی طرح دھرم پتنیاں، رام جیسے بیٹے، لچھمن جیسے بھائی، زینب کی طرح بہنیں، فاطمہ کی طرح بیٹیاں، عائشہ کی طرح بیویاں، گاندھی جیسے مہاتما اور مہاتما جیسے رہنما وقفے وقفے سے برابر پیدا ہوتے رہے اور ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے۔

بیچ عہد میں اگر حریت اور جمہوریت کے شیدائیوں میں ولہلم ٹل جیسی ہستی تھی۔ انقلاب فرانس کے وقت سیکڑوں جانبازوں کے ساتھ مدام رولاں تھیں۔ پچھلی صدی میں میزینی اور گریبالڈی گزرے ہیں تو خدا ہمارے زمانہ میں ہزاروں راؤ صاحبوں اور خاں صاحبوں کے جواب میں بھگت سنگھ اور شعیب اللہ ہوئے ہیں اور آج بھی جواہر لال نہرو ہیں، جن کی بدولت Secularism کی لاج باقی ہے اور جن کے دم قدم سے مہا سبھائی اور جن سنگھی، مسلم لیگی اور سوک سنگھی، دل شرومنی اور دراوڑ کازگمی کہلانے والے فرقہ پرست، بہر حال دبے ہوئے اور دبکے ہوئے ہیں۔ اگر زمانہ پرست، موقع شناس، خدغرض، ریاکار، مطلبی، اصول فروش اور موقع پرست آج کروروں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں تو سچے وفادار، پکے دوست، نیک دل، نیک مزاج، نیک صفات، نیک خیال، نیک چلن نیک جو اور نیک خو انسان ہرگز عنقا نہیں۔ معزول فرمانبرداروں کا ساتھ دینے والے چند سابق درباریے آج بھی اپنے حیوان نصیب آقاؤں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ہر مذہب و ملت کی، ہر قوم و نسل کی، ہر فرقے اور ذات کی لاکھوں عورتیں سچی پتی برتا اور پکی دھرم پتیاں ہیں۔ اگر دہلی یونی ورسٹی کے ہوتے ہوئے جامعہ ملیہ، ٹاٹا نگر کے توڑ پر سیوا گرام، کلکتہ یونیورسٹی کے مقابلہ میں شانتی نکیتن، مسلم یونیورسٹی کے جواب میں دارالمصنفین باقی ہیں تو مدراس میں مسز بیسنٹ کے ہر مذہبی لگاؤ کو قایم رکھنے والی تھیا سوفیکل سوسائٹی Theosophical Society) پٹنہ میں خدا بخش کے کارنامہ کو زندہ رکھنے والی اورینٹل لائبریری (Oriental Library) دیس بھگت کا سبق دینے والی پونا کی سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی (Servants of India Society) بنارس میں ناگری پرچارنی سبھا، علیگڈھ میں انجمن ترقی اردو، الہ آباد میں ہندی ساہتیہ سمیلن، دہلی میں ندوۃ المصنفین، پانڈیچری میں آروبندو آشرم جیسے رفاہی اور تہذیبی ادارے قایم ہیں اور اپنے وجود ہی سے ہمت، بے غرضی، خلوص، مستقل مزاجی، سچائی، ادب پروری اور علم دوستی کی تعلیم دے رہے ہیں۔

ہر قسم کی ترغیبوں اور تحریصوں کے ہوتے ہوئے علم و تحقیق، ادب اور آرٹ سے اٹوٹ وابستگیاں باقی ہیں۔ عیش و راحت دولت و فراوانی، شان و شوکت، طاقت اور رعونت، اقتدار اور ٹھاٹھ کے نمودی جھنڈوں اور رنگ برنگی پرچموں کے جھنڈ میں ایمان اور سیوا کا پھریرا برابر لہرا رہا ہے اور کلجگ میں بھی ست جگ کے دیئے بہر حال جل رہے ہیں۔

یہ اور اسی قسم کے خیالوں اور وچاروں سے نیتشے متاثر اور مسرور ہو کر کہتا ہے کہ اس دنیا میں ہم اپنے لئے چاہے دوزخ تیار کریں یا جنت۔ وہی ملک جو قدیم زمانہ میں رشکِ گلستاں تھا اور جو جسمانی اور ذہنی، علمی اور ادبی، فنی اور تنظیمی ہر اعتبار سے ترقی کرتے کرتے بلند ترین مرتبے پر پہونچ گیا تھا، آج برباد و ویران ہے، نسل وہی ہے، لوگ وہی ہیں، موسم وہی ہے، آب و ہوا وہی ہے۔ پھر بھی ہر طرف ویرانی اور بربادی نظر آتی ہے۔ نیتشے کہتا ہے کہ وہی یونان جس نے یورپ کو علم و ادب کے انگنت سبق دئے اور جس نے آرٹ کے انمول اور

لافانی شہ پارے اور شہ کار پیدا کئے آج اتنا نیچ ہے کہ اپنے ہی رائج کردہ علوم وفنون میں جانکاری یا مہارت نہیں رکھتا اور خود ہی کے لکھے ہوئے شہپاروں اور بنائے ہوئے شہکاروں کی قدر بندی نہیں کرسکتا۔ اس کی وجہ نیتشے کی رائے میں اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ موجودہ انسانوں میں یہ صلاحیت نہیں کہ بلندی کو زیادہ عرصے تک برقرار رکھ سکیں۔ بہترین سے بہترین انسان اقتدار حاصل کرنے کے بعد خدغرضیوں میں بتلا ہوتا ہے۔ عزیز نوازی، دوست پروری، خوشامد پسندی، غرور اور اینٹھ کا مادہ ظاہر ہوتا ہے، موجودہ انسانوں کی نجی کمزوریاں، فطری برائیاں اور قدرتی کوتاہیاں اتنی ہیں کہ اسے اونچائی پر پہونچنے کے بعد اونچا مقام برقرار رکھنے اور نیکیاں اور بھلائیاں پھیلانے میں بار بار ناکامی ہوئی ہے۔ ہم میں اب بھی بہت سی برائیاں موجود ہیں جو صرف تہذیب وتمدن کے پردے میں چھپی ہوئی ہیں۔ نظریۂ ارتقا کا قایل اور معتقد ہونے کے ناتے نیتشے مایوس نہیں ہوتا بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ دوامی برتری اس وقت باقی رہ سکے گی جب کہ موجودہ انسانوں میں بہتری کی امنگیں پیدا ہوں گی اور وہ ترقی کی خواہشوں اور ہر جہتی سدھار کے ارمان میں ارتقا کی ایک اور منزل طے کرکے فوق انسان بنیں گے چنانچہ نیتشے کہتا ہے:

"ہم نے نیم جانداروں سے ترقی کرتے کرتے موجودہ رتبہ حاصل کیا ہے، مگر اب بھی ہم میں ان ہی کی سی بہت سی خصوصیتیں باقی ہیں، کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اس سے زیادہ ترقی کریں اور انسانوں سے بہتر انسان پیدا کرسکیں؟"

ایک جگہ اور نیتشے کہتا ہے:

"عالم حیات میں ہر ہستی نے اپنے سے بہتر ہستی پیدا کی، اس کی بجائے کہ انسان کو مغلوب کرکے تم فوق انسان پیدا کرتے کیا تم یہ چاہتے ہو کہ حیوان کی طرف پھر عود کرو؟ کیا اس بحرارتقا کے مد کو جزر میں تبدیل کرتے ہو؟"

عورتوں کو مخاطب کرکے نیتشے کہتا ہے:

"کاش ہر عورت کھلونا بن سکے مثل قیمتی جواہر کے جس میں آنے والی دنیا کا نور ہو! اے عورتو! کاش ستاروں کی شعاعیں تمہاری محبت میں منور ہوں اور تمہاری یہ خواہش ہو کہ تم فوق انسان پیدا کرسکو!"

اس متوقع نسل کا نام نیتشے نے فوق انسان رکھا اور مستقبل کی تمام خوش آیند توقعات اور اپنے فلسفۂ سکھ پسندی سے پیدا ہونے والی امیدیں فوق انسان سے وابستہ کیں۔ سکھ پسندانہ فلسفہ کی طرح فوق انسانیت کا نظریہ نیتشے کے اہم ترین اور اساسی تخیلات میں سے ہے۔ سچ پوچھئے تو فوق انسانیت کا نظریہ سکھ پسندانہ فلسفے کا نتیجہ اور اسی کا جز گویا جز نظریہ ہے۔

نیتشے کا نظریہ فوق انسانیت

نیتشے نے یہ کہیں نہیں کہا کہ فوق انسان موجودہ انسانی نسل سے بالکل مختلف شکل وصورت کا آدمی ہوگا یا جسمانیات کے نگاہی نقطے سے موجودہ انسانوں اور فوق انسانوں میں نمایاں فرق ہوگا۔ یا یہ کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور ہر فوق انسان کی عمر تین تین یا چار چار صدیاں ہوا کرے گی۔ اس قسم کی لغو باتیں نیتشے نے کبھی نہیں کہیں اور یہ زیادہ تر ان لوگوں کے خود ساختہ تخیلات ہیں جنھوں نے نہ کبھی نیتشے کی تصنیفوں کا مطالعہ کیا اور نہ نیتشے کے بارے میں مستند کتابیں اور مضمون پڑھنے کی زحمت گوارا کی۔

نیتشے کی مراد فوق انسان سے ایسے آدمی سے تھی جو وجدانیت کا نہیں بلکہ عقلیت کا ہیرو ہوگا جو نفسانی لذتوں کا خواہشمند نہیں بلکہ سمجھدارانہ یا معقول خوشیوں کا طالب ہوگا۔ وہ نفس کا غلام نہیں بلکہ دماغ کا تابع ہوگا وہ انسانی نسل جس میں کمترین برائیاں اور زیادہ سے زیادہ خوبیاں ہوں گی، فوق انسانوں کی نسل ہوگی۔ وہ فرشتے نہ ہوں گے بلکہ فوق انسان ہی رہیں گے ان میں برائیاں بھی ہوں گی مگر اس مجسمۂ اوصاف میں یہ برائیاں بالکل ناقابلِ لحاظ ہوں گی۔ جس طرح سمندر کا پانی غلاظت اور گندگی کے پڑنے سے غلیظ اور گندہ نہیں ہو جاتا اور سمندر سمندر کی حیثیت سے پاک وصاف ہی رہتا ہے، اسی طرح فوق انسان کی برائیاں اور کوتاہیاں اس کی اچھائیوں اور بھلائیوں میں گھل مل کر ایسی ہوجائیں گی جیسے گلی گلی سے بہہ کر آتا ہوا پانی محض گنگا میں آنے کی وجہ سے گنگا جل کہلاتا ہے اور پاک وپوتر مانا جاتا ہے۔ غرض

جس طرح بدبودار پانی کے گرنے سے بڑی بڑی ندیاں متاثر نہیں ہوتیں اسی طرح فوق انسان کا کردار اس کی چند بدخصلتوں کی وجہ سے متاثر نہیں ہوسکے گا۔

نیتشے کی تصنیفوں کا مطالعہ کرنے سے اچھی طرح واضح نہیں ہوتا کہ اس کے ذہن میں فوق بشر کی کیا تصویر تھی۔ بظاہر نیتشے توقع کرتا ہے کہ انسان کے افعال اور کردار میں جس قدر بے سمجھ پن پایا جاتا ہے، اس کی سیرت و ذہنیت میں جس قدر عدم عقلیت ہے وہ کم ہوتے ہوتے تقریباً مفقود ہوجائے گا، وہم پرستی اور نادانی، جھوٹی شیخی اور جھوٹا اطمینان، غیر دانشمندی اور نفس پرستی ناانصافی اور جاہلیت کم ہوتی جائیں گی اور ان کی جگہ سمجھ اور عقل، انصاف اور ایمان، سچائی اور بے غرضی کا عمل دخل بڑھے گا اور مجموعی طور پر انسانوں کی صحت بدرجہا بہتر ہوگی اور وہ جمالیاتی، جسمانیاتی اور سماجیاتی اعتبار سے امکانی حد تک بہترین اور تقریباً مکمل انسان یعنی فوق انسان ہوگا۔

نیتشے جو دل و دماغ سے نظریۂ ارتقا کا معتقد تھا باور کرتا تھا کہ ارتقا کی آخری منزل انسان نہیں ہے، کیونکہ انسان کے دماغ نے کافی ترقی کرلی، اپنی قابلیت کی بدولت زمین اور سمندر پر کامیابی حاصل کرلی، ہوا سے مقابلہ شروع کرنے کے بعد نصف صدی میں اسے بھی مغلوب کرلیا اور اب دوسرے سیاروں سے ربط قایم کرکے ساری کائنات میں اپنا اقتداری جال پھیلانے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اسے یہ دھن بھی ہے کہ سمندر کی تہ سے غذا اور چاند و مریخ کی سطح سے دھاتیں حاصل کرے۔ اس نے خاص کر میکانیت اور صنعتیت میں اچنبھے میں ڈالنے والی ایجادیں اور اختراعیں کیں۔ تحقیق اور تفتیش کے سہارے یا فنکاریوں کے بل بوتے، قدرت کے مقابلہ میں ایک ذاتی قدرت پیدا کی۔ قدرت کی غلطیوں کو دور کیا، کوتاہیاں کم کیں، پہاڑ کاٹے، غار بنائے، پلوں کی تعمیر کی، ندیوں کو روکا، خلیجوں کو پاٹا، سمندروں کو ملایا، عظیم الشان ابشار بنائے، بجلی کو مقید کیا، بلندی اور پستی کی تفریق کو کم کرکے ہموار سڑکیں بنائیں، زمان و مکان، وقت اور فاصلے کی اہمیت گھٹادی، پہاڑوں سے مقابلہ کرنے والی عمارتیں، پاتال میں چلنے والی ریلیں، شاہین اور عقاب سے بلند تر اور ان سے بھی تیز تر چلنے والے ہوائی جہاز طیار کئے، غرض ایجادوں اور فنکاریوں کے ذریعے انسانی دماغ نے اپنی قابلیت کا بہترین سے بہترین اور اعلا ترین ثبوت پیش کیا۔

یہ سب صحیح ہے مگر انسان کے دماغ ہی نے ترقی کی۔ انسان کی خصلت و طینت میں بہتری تو کجا کسی قسم کی تبدیلی بھی نہیں ہوئی۔ ہمارا کردار ہماری ذہنیت اور ہمارے اخلاق وہی ہیں جو آج سے سو ہزار یا دس ہزار سال پہلے تھے۔

انسانوں کی سیرت اور کردار کا غائر نظر سے مطالعہ کرنے والے فلسفیوں، نفسیاتی ماہروں اور مردم شناسوں کے مطابق انسانوں کی جبلتی خصوصیتیں ایسی تو نہیں ہیں جن کی بنا پر اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ ہوسکے۔ کسی سیاہ بین، انسان بیزار، تارک الدنیا سنیاسی نہیں بلکہ امانیول کانٹ جیسے عالم و یکتائے زمانہ نے کہا ہے:

> "اگر ہر شخص کو یہ معلوم ہوجائے کہ اس کے ملاقاتی، دوست، احباب، عزیز، اقارب، پڑوسی اور اغیار اس کے بارے میں کیا خیال رکھتے ہیں اور کس حد تک اس کے سچے خیر خواہ ہیں تو انسان ایک دوسرے سے بھاگنے اور دوسروں کی پرچھائیوں سے ڈرنے لگیں گے"۔

دشمن دوست کی شکل میں، رہزن رہنما کے بھیس میں، کپٹی بہی خواہوں کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ دنیا بھر میں ریاکاری، جھوٹی دوستی بے وفائی، بے مہری پھیلی ہوئی ہے۔ ہر جگہ سرد مہری چھائی ہے۔ چار دانگ عالم میں تن پروری اور آرام طلبی کی خاطر پیسے کا زور ہے، روپے کا راج ہے، سونے چاندی کی حکومت ہے، زر کی پوجا ہو رہی ہے اور ہر طرف نوٹوں کا ڈنکا بج رہا ہے۔ انسان مختلف برائیوں کا مجسمہ ہوگیا ہے، خاص کر خود غرضی اور خدنمائی اس کی کئی خوبیوں کو غارت کر رہی ہے۔ کرورہا انسان صرف مصلحت سے نیک چلن ہیں اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ موجودہ انسانوں میں برائیاں بہت زیادہ اور بھلائیاں برائے نام ہیں۔ صرف تعدادی اعتبار سے نہیں بلکہ زور اور گہرائی کے لحاظ سے بھی اچھائی اور برائی میں ایک راکشس اور ایک معصوم کا سا فرق پایا جاتا ہے۔ اس میں رتی برابر شک نہیں ہے کہ شرافت کے لحاظ

سے یعنے اخلاقیاتی نقطۂ نظر سے انسان نے مطلق ترقی نہیں کی۔ دغابازی، رشوت خاری، احسان فراموشی اور کینہ پروری گزشتہ زمانوں کی طرح اب بھی ہیں، مگر موجودہ زمانہ میں پاک دل، نیک ذات، نیک صفات، ملنسار، امن پسند، شائستہ دوست، غیرت مند اور ہمدرد انسان پائے جاتے ہیں تو یہ پچھلے زمانہ کے کسی دور میں مفقود نہ تھے۔ اگر موجودہ زمانہ میں وطن فروش، ملک فروش، اصول فروش اور مسلک فروش پائے جاتے ہیں تو پرانے زمانہ میں بھی دُنیا پرستوں اور خُشامد پسندوں کی کہیں کمی نہیں تھی۔

بہرطور انسان کے دماغ میں نور ہے تو دل میں حسب معمول تاریکی پائی جاتی ہے۔ عقل ترقی کر رہی ہے، سیرت جمود میں مبتلا ہے۔ مادی تمدن بڑھ رہا ہے، روحانی تہذیب تعطل میں گرفتار ہے، بدھی بڑھ رہی ہے، جسم مایا کے چنگل میں پھنسا ہے، غرض دماغ ترقی کر رہا ہے، مگر اخلاق و کردار، افعال و اعمال میں کوئی بہتری نہیں پائی جاتی۔

رجائیت کا فلسفی، سکھ پسندی کا پجاری، ترقی کا خواہاں، وکاس کا آرزومند، ارتقائیت کا معتقد نیتشے مایوس نہیں ہوتا وہ سوچتا ہے کہ جس طرح بے جان چیزوں سے نیم جان درختی جانور، کیڑے، مکوڑے، کیچوے اور مچھلیاں، رینگنے اور جل تھلئے، چوپائے اور دوپائے اور آخرکار آدمی پیدا ہوئے ہوں گے، اسی طرح انسان سے فوق انسان پیدا ہوں گے، یہ نہ صرف لاجواب دماغی قابلیت کے آدمی ہوں گے بلکہ ان کے اخلاق بھی اونچے ہوں گے۔ وہ نفس کے پجاری، حسیات کے تابع دل کے محکوم نہ ہوں گے بلکہ دماغ کے فرمانبردار ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان دنیا میں آئیڈیل زندگی گزاریں گے۔

فلسفۂ فوق انسانیت کی تائید میں اصولی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ارتقاء کا نظریہ اگر صحیح ہے (اور اس کے صحیح ہونے کا جسمانیات اور زندگیات کی طرح نہ صرف زمینیات اور آسمانیات بلکہ حیوانیات اور انسانیات کو یقین ہے) تو کوئی وجہ نہیں کہ ارتقاء انسان پر ختم ہوجائے اور انسانوں سے بہتر انسان بقول نیتشے فوق انسان پیدا نہ ہوں، خاصکر جبکہ تاریخی دور ہی میں اکثر افراد اس قسم کے گزر چکے ہیں اور موجودہ زمانہ میں بھی یقیناً بعض انسان ایسے موجود ہیں جو دماغی، عقلی، اخلاقی تینوں اعتبار سے پائے تکمیل کو پہونچ چکے ہیں۔

اپنے ہم قوموں میں نیتشے، امانیول کانت، گوئٹے اور بیٹ ہوون کو، قدیم یورپیوں میں سقراط، افلاطون اور ارسطو کو، بیچ عہد کے یورپیوں میں لیونارڈو دوونچی، رافئل اور لوتھر کو، امریکیوں میں واشنگٹن اور ابراہام لنکن کو فوق انسانوں کی قبل نشانیاں یعنے Vorerscheinungen یا قبل ظہور اور آثار ظہور سمجھتا تھا تو کیا ہم کنگ نوتسو گوتم بدھ، اشوک، ابن خلدون، اکبر اعظم شاہجہاں اور کلسی داس کو فوق انسان کی قبل نشانیاں یا آثار ظہور نہیں تصور کرسکتے؟ قریبی ماضی اور موجودہ زمانہ کے بھی چند افراد مثلاً سرسید، غالب، انیس، حالی، رابندر ناتھ ٹیگور، برناڈشا اور سب سے بڑھ کر مہاتما گاندھی کیا اسی زمرے میں داخل نہیں کئے جاسکتے جو شرافت، عقلیت، اخلاق، ذہانت، فعلیت اور کارکردگی کے نگاہی نقطوں سے پایہ تکمیل کو پہنچے ہوئے نظر آتے ہیں؟

مثالوں میں چاہے اختلاف رائے ہو، مگر اس میں شک نہیں کہ ایسی ہستیاں گزر چکی ہیں اور اب بھی ہیں جو فوق انسانی مرحلہ کی خوش خبری بنی آدم کو پہونچاتی ہیں۔ اگر جانوروں سے انسان بننا ممکن تھا اور صحیح ہے تو انسانوں سے فوق انسان بننا کیونکر اصولاً ناممکن اور غلط ہوسکتا ہے۔ اگر ارتقائیت کا نظریہ صحیح ہے تو دوسرا لازماً غلط نہیں ہوسکتا، کیونکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ ارتقا کا عمل درآمد ختم ہوچکا اور اب مد کے بعد جزر ہے۔ اگر بدترین سے بد، بد سے خوب، خوب سے خوب تر بننا ممکن تھا تو کیا معنے کہ خوب تر سے خوب ترین بن سکے۔

نظریۂ فوق انسان سے واقف ہونے کے بعد جب میری نظر سے یہ شعر گزرا تھا:

شبیہہ مدنظر ہے کس کی کہ کوئی پوری نہیں اُترتی؟
ہزاروں نقشے فلک نے کیسے مٹا دئے ہیں بنا بنا کے!

یا جب میں نے حیدرآباد کے ایک نوجوان شاعر، امان ارشد صاحب کا یہ شعر سنا تھا:

بنا رہے ہیں ہم انساں کی اک نئی تصویر،
ہمارے فن کا ابھی شاہکار باقی ہے!

تو مجھے لامحالہ نیتشے کا خیال آیا اور احساس ہوا کہ فلسفے اور سماجی علوم میں نہ سہی ادب و شاعری میں تو بہرحال ہمارے ہم قوموں اور ہم زمانوں کو فوق انسانیت کا احساس و ارمان ہے۔

نیتشیانہ تعلیمات کا ایک اور اصول جو ہم ہندوستانیوں کے لئے بہت اہم، لہٰذا قابلِ غور اور حتی المقدور قابل پیروی ہے۔

عدم مداخلتی اصول کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جیسے جیسے میری عمر بڑھتی جاتی ہے اور جس قدر زیادہ مجھے ہندوستانیوں کی گھریلو زندگی اور اجتماعی تنظیم کی خامیوں کا علم ہوتا ہے، جس قدر مجھے گھریلو جھگڑوں اور آپسی اختلافوں کی وجہیں معلوم ہوتی ہیں اسی قدر میرا یہ خیال پختہ ہوتا جاتا ہے کہ ہماری سماجی اور تمدنی زندگی کی بڑی سی بڑی خوبیوں میں ہم لوگوں کی مداخلت پسندی بھی ہے۔

قانون ساز جماعتوں، میونسپالٹیوں اور پارلیمانوں کے ارکان کو چھوڑئے، معمولی معمولی کمیٹیوں کے رکن، ٹیموں کے افراد، دفتر کا عملہ، خاندان کے لوگ، عزیز اقارب، دوست، دوست نما اغیار اور سب سے بڑھ کر سسرال والے اور پڑوسی سبھوں میں یہ لت ہے کہ وہ خواہ مخواہ غیر متعلق معاملوں میں مداخلت کر کے بے لطفی پیدا کرتے ہیں۔

یہی لوگ خود کے تفویض شدہ امور پر پوری توجہ، توانائی اور وقت صرف نہیں کرتے وہ نجی کاموں کو ممکنہ حد تک بہترین نہیں بناتے، وہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا خیال نہیں کرتے۔ وہ خود سدھار کی طرف متوجہ نہیں ہوتے انھیں دوسروں کا درد کھائے جا رہا ہے۔ انھیں آٹھوں پہر دوسروں کی چنتا اور دوسروں کی بہتری کی فکر رہتی ہے، اسی نام نہاد جذبۂ ہمدردی سے سرشار اور مجبور ہو کر وہ دوسروں کے کاموں میں مداخلت کر کے نہ صرف خود کوفت زدہ ہوتے بلکہ دوسروں کو اذیت پہونچاتے ہیں۔

مزے کی بات تو یہ ہے کہ مداخلت پسند اصحاب نیک نیتی کے بہانے نیک بخت کا سوانگ اختیار کر کے اپنی مداخلت پسندی کا جواز پیش کرتے اور اپنی غلط کاری سے لامحالہ پیدا ہونے والے پچھتاوے کو بھلانا چاہتے ہیں گویا محض نیک نیتی اور شبہ خیالی، بے وقوفی اور جہالت یا بداعمالی اور غلط کاری کا جواز ہو سکتی ہے، تب ہی ترکوں میں یہ دعائی کہاوت بہت مقبول ہے:

"خدایا! تو مجھے میرے دوستوں سے بچا، اپنے مخالفوں اور دشمنوں سے میں آپ اپنی حفاظت کر لے سکوں گا!"

نیتشے جس حد تک عدم مداخلت کا قایل تھا اس کا اندازہ آپ اس نہایت مختصر اور موثر چٹکلے سے کر سکیں گے، جس کے لئے اردو میں تو کوئی نام نہیں اور جسے یورپی بھاشاؤں میں Aphorism کہتے ہیں۔

نیتشے نے کہا ہے:

"Ein Wort des Rates gib nicht!" — A word of advice don't give it!

"بقول زردشت" میں کہا گیا ہے:

"سب سے مقدم بات یہ کہی جاتی ہے: 'اپنے پڑوسیوں سے محبت کرو' 'اپنے پڑوسیوں کو انھیں کے حال پر چھوڑ دو!' اور نیک چلنی کا یہی پہلو اہم تر اور مشکل تر ہے!"

آپ جانتے ہوں گے کہ حافظ نے عدم مداخلتی اصول کا پرچار کرتے ہوئے کہا تھا:

نہ قاضیم، نہ مدرس، نہ محتسب، نہ فقیہہ
مرا چہ کار؟ کہ منع شراب خواری کنم!

اور خود ہماری زبان کے شاعر نے کہا ہے:

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو!

مفہوم اور غرض، منشا و مطلب کے لحاظ سے مختلف زمانوں اور ملکوں کے لوگ بات تو ایک ہی کہہ رہے ہیں مگر نینوں کا رنگ، پیرایۂ بیان طرز اظہار بالکل الگ ہے۔

ہماری زبان میں ایک کہاوت بھی ہے جس میں نیتشیانہ طرز کی جھلک پائی جاتی ہے اور عدم مداخلتی پالیسی کی تلقین کی گئی ہے:

"پرائی شادی میں عبداللہ دیوانہ!"

ہم لوگوں میں مداخلت کی بری عادت اتنی عام ہوگئی ہے کہ غمی کے موقع پر بھی دخل در معقولات کرکے غم زدہ لوگوں کو اور زیادہ پریشان کرتے ہیں اور جیسا کہ وحیدالدین سلیم صاحب نے خوب کہا تھا کہ ہم پر اس مثل کے دونوں روپ صادق آتے ہیں یعنی:

"پرائی شادی میں عبداللہ دیوانہ!"

اور: "پڑوس کی موت میں حمیداللہ باولہ!"

نیتشے کس حد تک عدم مداخلتی اصول کا حامی تھا؟ اس کا اندازہ ہمیں اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ نیتشے رحمدلانہ موت یا آزادانہ موت کو بھی جایز قرار دیتا تھا اور بعض صورتوں میں اس کی ضرورت بلکہ جواز اور افادیت کے موافق ہو کر کبھی تو یہ کہتا ہے:-

"فالتوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔ بہت ہی زیادہ لوگوں کی وجہ سے زندگی تلخ ہو چکی ہے۔ کاش کوئی انھیں ابدی زندگی کی لالچ میں اس زندگی سے لے اڑے!"

اور کبھی یہ:-

"کئی لوگ بہت دیر سے مرتے ہیں اور چند ہی قبل از وقت۔ ابھی یہ تعلیم اجنبی سی معلوم ہوتی ہے کہ 'ٹھیک وقت پر مرو' 'ٹھیک وقت پر مرو' یہی زردشت کی تعلیم ہے!"

آپ نے سنا ہوگا کہ موجودہ زمانہ کی کئی ترقی یافتہ، ترقی پسند اور ترقی پذیر ملکوں میں یہ تحریک چالو ہے کہ لاعلاج بیماریوں میں مبتلا، جم راج کے چنگل میں پھنسے ہوئے، آٹھوں پہر دکھ سہہ سہہ کر نراس ہو جانے والوں کو خود انھیں کی خواہش اور تحریری اجازت پر موت کی میٹھی نیند لانے والی دوا دیجائے۔ چونکہ اس کی اصل وجہ اہم ہے، اس لئے اسے یعنی رحمدلانہ موت یا دیاہتیا کہتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں دیاہتیائی تحریک ناقابلِ لحاظ نہیں ہے اور رحمدلانہ موت کو جائز قرار دینے کی کوشش بڑھتی جا رہی ہے۔

اس حقیقت سے ظاہر ہے کہ نیتشے کس قدر زیادہ اپنے زمانہ سے آگے تھا۔ اس قول کے بالکل برعکس

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

وہ خاندانی منصوبہ بندی، شادی بیاہ میں نسل سدھارانہ مسلک، تعلیم، محنت، کھیل اور تفریح پر متناسب توجہ سے دماغی اور جسمانی ترقی اور حسب دلخواہ یا آزادانہ موت کا قایل تھا۔ گویا جدید اصطلاحاتی زبان میں نیتشے

خاندانی منصوبہ بندی	Family Planning
طاقت اور حسن کی تحصیل	Ways to Strength & Beauty
تعلیم اور خوشحالی	Education & Welfare
اور: آزادانہ موت	Euthanasia

کا موافق اور مبلغ تھا۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے ہم نیتشے کی مفکرانہ حیثیت کے بارے میں یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ سب سے زیادہ سکھ پسندانہ فلسفے کا معتقد تھا

اور اس نے سکھ پسندی کی تلقین بہت اچھی طرح کی، نیز اس کو سمجھانے کے لئے بڑی نرالی تشبیہیں اور دلآویز مثالیں دیں۔ "نیتشے کی ادیبانہ حیثیت" نامی مضمون میں میں نے اس کی متعدد مثالیں دی ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ نیتشے کہتا ہے،

"فرطِ مسرت کی بدحواسی شدتِ غم کی بدحواسی سے بہتر ہے۔ بدمست رقص لنگ سے بہتر ہے"

سکھ پسندانہ فلسفے کی تشریح کرتے ہوئے نیتشے نے نظریۂ فوق انسان کی اہمیت و صداقت بخوبی واضح کی۔ اگرچہ یہی اس کا کارنامۂ حیات تھا مگر اس کے علاوہ بھی نیتشے نے بڑے بڑے کام انجام دئے۔ بہت سے فلسفیانہ جز مسئلے حل کئے، اخلاقیات اور جمالیات، مذہبیات اور نفسیات، آوازات اور زبانیات، فنونِ لطیفہ اور صرف و نحو کے بارے میں بڑے معنی خیز اور سنجیدہ نکات بیان کئے، جن کی تشریح و توضیح سے نیتشے کے ذہنی دبستان کو خوب پھیلایا یا متعلقہ علوم کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

ان سب کے برابر شاید ان سے بڑھ کر نیتشے کا یہ کارنامہ مدتوں زندہ رہے گا کہ نیتشے نے سنجیدہ اور فلسفیانہ تنقیدی اور تشریحی خیالات کو نہایت دلآویز، موثر اور پر لطف زبان میں پیش کر کے اپنی متعدد تصنیفوں اور گراں قدر مضمونوں کے ذریعہ جرمن ادبیات کی ایسی خدمت کی جس سے جرمن زبان و ادب کا معیار اور زیادہ بلند ہو گیا کہ نیتشے کی مفکرانہ حیثیت اہم تر اور بلند تر ہے یا اس کی ادیبانہ حیثیت۔

"ڈاکٹر جعفر حسن" کا مقالہ بجنسہ شایع کیا جاتا ہے اور جو سقم یا مجہول عبارت میں پایا جاتا ہے اسے بھی دور نہیں کیا گیا کیونکہ ان کی خواہش یہی تھی۔ املا، ترجمہ اور ترکیب الفاظ کا جو اصول انھوں نے اختیار کیا ہے اس سے مجھے اتفاق نہیں ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس بات سے مجھے اتفاق نہ ہو، وہ غلط ہی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات اسی کو پسند کریں۔

بہر حال معنویت کے لحاظ سے یہ مقالہ مطالعہ کے قابل ہے اور اسی نقطۂ نظر سے اسے دیکھنا چاہئے۔ (نیاز)

تصانیف نیاز فتحپوری

عمائتی قیمت — عمائتی قیمت

من و یزداں — مذہبی استفسارات و جوابات — جمالستان — نگارستان — شہوانیات

مکتوبات نیاز تین حصے — انتقادیات — حسن کی عیاریاں — مالہ وما علیہ — شہاب کی سرگزشت

فلاسفۂ قدیم — مذاکراتِ نیاز — فراست الید — مذہب — نقاب اٹھ جانے کے بعد

میزان

یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف چالیس روپئے میں مل سکتی ہیں

منیجر نگار لکھنؤ

ترکوں کے عہد میں

سرزمینِ دمشق کا ایک رومان

ایک طرف شام اپنی تمام ممکن ملاحتوں اور شفقی رنگینیوں کے ساتھ، دوسری طرف آسمان اپنی تمام پاکیزہ زمرد آگینیوں کے ساتھ۔ سرزمینِ دمشق میں ایک سحر کارانہ کیفیت پیدا کر رہا تھا اور وہ موجِ نشاط جو غروب آفتاب کے بعد ہی ہوا کے پہلے ٹھنڈے جھونکے سے وہاں پیدا ہو جاتی ہے، چاروں طرف فضا میں کھیل رہی تھی۔

احمد کا محل جو نہایت سفید سنگ مرمر سے تعمیر کیا گیا تھا، ایک وسیع باغ کے اندر، آسمان کے نیلگوں فضا میں جاذب قلب و نگاہ تھا۔ اور چاروں طرف کی فصیل پر گلاب اور چنبیلی کے پھول سڑک پر چلنے والوں کو اس طرح نظر آتے تھے، جیسے شام و دمشق کی بلند بالا حسین لڑکیاں جھانک رہی ہوں، فوارہ کے قطرات حوض کے پانی میں گر گر کر اک سیمیں آواز پیدا کر رہے تھے، اور نارنج و ترنج کے کنجوں کی خوشبو سے مست ہو ہو کر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔

اس شام کو آفتاب کی شعاعوں نے آسمان پر صدف کے سے مختلف رنگ پیدا کر رکھے تھے، باغ پر اک سکون طاری تھا اور اگر کبھی کوئی آواز آتی بھی تھی تو فاختہ کی یا کسی کے ہلکے قدموں کی جو تاک کی جھاڑیوں میں ایک روش پر مصروف خرام تھا۔

سلمہ، جو احمد کی حرم سرا میں سب سے زیادہ حسین لڑکی تھی، اس وقت باغ میں محو گلگشت تھی، سپید ریشمی نقاب الٹ کر سر کے اوپر ڈال دیا گیا تھا اور اس کے سرخ ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم، ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے نسیم نے گلاب کی پنکھڑیوں کو جنبش دیدی ہو، وہ اس وقت بہت مسرور تھی۔

دمشق کا موسم بہار، سترہ سال کی نوجوانی اور پھر فرشتۂ محبت کی مستی۔ اُسے مسرور ہونا چاہئے تھا۔ وہ شام کے اُس حصہ کی رہنے والی تھی، جہاں فطرت تقسیم حسن کے لحاظ سے بڑی فیاض ہے۔

اس کے جسم کا کھلا ہوا حصہ، آفتاب کی شعاعوں سے ایک تابشِ زریں بن گیا تھا اور لباس میں چھپا رہنے والا حصہ جب کھل جاتا تھا تو محسوس ہوتا تھا کہ جلد کے نیچے چاندنی مسکرا رہی ہے، اس کے بالوں کے ہلکے گھونگر والے بال گویا سیاہ ریشم کے لچھے تھے جو ابھی ابھی سلجھا کر چھوڑ دئے گئے تھے، اس کی حسین آنکھوں کے سُرخ سُرخ ڈورے، معلوم ہوتا تھا کہ جوانی کی شراب پلکوں سے ٹپک رہی ہے۔ اس کی پیدائش، بیروت کے گرم و خشک پہاڑوں میں ہوئی تھی اور بہت کم سنی میں مالِ غنیمت کی صورت سے احمد کے پاس پہونچی تھی جو دمشق کا نہایت دولت مند تاجر و زمیندار تھا۔

احمد ایک ترک سردار تھا اور وہ تمام صفات جو ایک ترک میں فطرتاً پائی جاتی ہیں، اس میں بھی موجود تھیں وہ ان لوگوں کے ساتھ جو اس سے متعلق تھے حد درجہ لطف و نرمی سے پیش آتا تھا اور حبشی غلاموں سے لے کر خواتین حرم تک سب کے لئے سراپا رحمت و شفقت تھا۔ کسی ترک کا حکومت کرنا گویا امن و سکون کا حکومت کرنا ہے، اس لئے احمد کا قصر بھی اک جولانگاہ مسرت و نشاط تھا اور یوں بھی احمد خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ حسین تھا۔

سلمہ، ایک وحشی قبیلہ کی لڑکی تھی اور ابتدا سے اس کو وہ تربیت میسر نہیں آئی تھی جو ترک خواتین میں عام طور سے رائج ہے، اسلئے

وہ احمد کی حرم سرا میں آکر "مربیات حرم" کے سپرد کر دی گئی اور اُن کی تربیت میں نشو و نما پانے لگی۔ حتیٰ کہ اب جبکہ اس کی عمر سترہ سال کی ہو چکی وہ ایک ایسی مہذب و شائستہ لڑکی بن گئی کہ مشکل سے احمد اپنے تئیں اس کے سحر سے بچا سکتا تھا، آخر کار اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس کے ساتھ شادی کر کے نہ صرف اپنی دولت بلکہ اپنی روح بھی اس کی سپردگی میں دیدے گا۔ ہر چند حرم کا ہر شخص اس حقیقت سے آشنا ہو چکا تھا اور سب کو یقین تھا کہ کسی نہ کسی دن احمد کے یہ مخفی جذبات بروئے کار آنے والے ہیں، لیکن سلمہ ابھی تک اس سے بے خبر تھی اور وہ احمد کی بیوی، حرم سرا کی ملکہ بن جانے کو اتنی بڑی خوش بختی سمجھتی تھی کہ اگر کبھی اس کا خیال بھی آتا تو فوراً مایوس سائس کے ساتھ اس خیال کو دور کر دیتی۔ وہ ایک سنہری تیتری کی طرح فضائے گلشن میں نشو و نما پا کر ادھر اُدھر آزادی سے پھرتی رہتی تھی، لیکن اس سے آگاہ نہ تھی کہ کنجوں کے اندر ایک ہاتھ اس کو گرفتار کرنے کے لئے بیتاب ہے۔

چاندنی رات تھی، اور سلمہ جس کے جذبات میں ہر طلوع ماہ کے ساتھ ناقابلِ ضبط ہیجان پیدا ہو جاتا تھا، اپنے شباب کی خواہشوں اپنی جوانی کی تمناؤں سے مجبور ہو کر فصیل کے پاس ایک روش پر مضطربانہ ٹہل رہی تھی، کہ ایک نارنگی اس کے سینہ پر آکر لگی، اس نے گھبرا کر گردن اُٹھائی تو دیکھا کہ ایک نوجوان جو اپنی صورت کے لحاظ سے ایک فرشتہ معلوم ہوتا تھا، فصیل پر بیٹھا ہوا مسکرا رہا تھا۔ سلمیٰ ڈری اور چیخ مار کر بھاگنا چاہتی تھی کہ وہ نوجوان اُترا اور دو زانو ہو کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولا "اے سلمہ، میں انسان ہوں اور اس زمانہ سے تیرا فریفتہ، جب تو اول اول اس باغ میں تفریح کے لئے آئی تھی، میں روز تجھے اس باغ میں مصروف خرام دیکھتا ہوں اور روز اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ تیرا خیال اپنے دل سے نکال دوں، لیکن میں کامیاب نہیں ہوا اور آخر کار مجبور ہو کر مجھے تیرے قدموں تک پہونچنا پڑا۔ اس میں شک نہیں کہ تو حسن کی دیوی ہے اور دمشق کے سب سے بڑے دولتمند شخص کی حرم سرا میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ لیکن میں باوجود مفلس و غریب ہونے کے بھی تجھ پر ایک حق رکھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ میں اُسی بستی کا رہنے والا ہوں جہاں تو پیدا ہوئی اور مجھے بھی اسی قوم کا ایک فرد ہونے کی عزت حاصل ہے، جس کا خون تیری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔"

سلمہ جو اس سے قبل آگاہ نہ تھی کہ کسی مرد کا محبت بھرا ہاتھ جسم سے مس ہو جانے کے بعد دل میں کیا کیفیت پیدا ہو سکتی ہے جو اس حقیقت سے بالکل ناآشنا تھی کہ ایک مرد کا اظہار محبت کیونکر رگوں میں بجلی دوڑا سکتا ہے، مسحور سی ہو گئی اور دیر تک مخمورانہ کیفیت میں مبتلا رہی، اس کی حالت اس وقت ایسی تھی جیسے کوئی بھنور میں پھنس جائے اور گھبرا کر ہاتھ پاؤں بے قابو ہو جائیں۔

اجنبی نوجوان دیر تک اظہارِ محبت کرتا رہا اور سلمہ خامشی یا بے ہوشی کے عالم میں اسے سنتی رہی شاید وہ ابھی کچھ دیر اور اس حالت میں مبتلا رہتی، لیکن صحن باغ کی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی اور وہ دفعتاً چونک پڑی۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے جدا کیا اور بولی کہ "تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ، کیونکہ تمہارا یہاں ٹھہرنا، تمہارے لئے موت ہے، اس نے جواب دیا کہ "اے سلمہ صرف ایک لمحہ تجھ کو دیکھ لینا ایک انسان کے لئے اتنی طویل زندگی ہے کہ اس کے حصول کے بعد موت کا خطرہ ضعیف ہو جاتا ہے اور اس لئے میں اب دُنیا میں کسی چیز سے نہیں ڈر سکتا، مگر اُس وقت سے کہ تو مجھے ٹھکرا دے، میری محبتوں کو رد کر دے۔" سلمہ اس کا جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ محل سرا سے نوحہ و شیون کی آواز بلند ہوئی اور سلمہ سمجھ گئی کہ اس کے آقا کی بیوی جو عرصہ سے علیل تھی مر گئی ہے، وہ پھر گھبرا گئی، محلسرا کی طرف بھاگ جانے کے لئے آمادہ ہوئی، لیکن اس نوجوان نے اُس کا دامن پکڑ لیا اور چونکہ سلمہ کا جسم بالکل بے قابو تھا اس لئے وہ اس کے آغوش میں گر پڑی اور اس طرح عشق کی پہلی منزل طے ہو گئی۔

(۲)

اس واقعہ کے پانچ دن بعد سلمہ حوض پر بیٹھی ہوئی فانوسی فاختاؤں سے کھیل رہی تھی اور اُس نوجوان کی یاد جس کا نام مراد تھا اس کے دماغ کو معمور کئے ہوئے تھی اور سوچ رہی تھی کہ جب وعدہ کے مطابق دو ہفتہ گزر جانے کے بعد وہ مجھے لینے آئے گا تو میں کیونکر نکل سکوں گی۔ جس کاروان کے ساتھ وہ مجھے لیجانا چاہتا ہے، کیوں نہیں اسی ہفتہ کوچ کرتا۔ میرے بھاگ جانے پر

احمد کیا کہے گا۔ یقیناً میری ناشکری ہے کہ میں اس طرح چھوڑ کر چلی جاؤں گی، لیکن میں اس طرح کی زندگی جو باوجود تمام اسباب عیش و مسرت کے ویران و غیر آباد ہے کب تک بسر کئے جاؤں گی۔ الغرض وہ اسی قسم کے مختلف خیالات میں مستغرق تھی کہ ایک کنیز آئی اور اس نے نہایت ادب سے دست بستہ عرض کی کہ "آقا نے یاد فرمایا ہے"۔

سلمہ کے لئے یہ پہلا موقعہ تھا کہ احمد نے اُسے بلایا ہو، اس لئے وہ اس غیر متوقع خبر سے چونک پڑی، اور ایک عجیب قسم کا خوف و ہراس لئے ہوئے وہ کنیز کے پیچھے پیچھے ہولی، جب محل سرا کے اندر پہونچی تو احمد کے کمرہ کی طرف اس کے رہنمائی کر دی گئی۔ احمد، فرش پر تکیہ لگائے نیلگوں قبا پہنے ہوئے مضمحل بیٹھا ہوا تھا، اور اس کے چہرے سے ایک شاہانہ انداز پیدا تھا، سلمہ جس کو اس وقت تک احمد کے روبرو آنے یا گفتگو کرنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ سامنے آتے ہی فرط رعب سے مغلوب ہو کر سجدہ میں گر پڑی۔ احمد نے جلدی سے اُسے اُٹھایا اور نہایت ہی شفقت کے ساتھ اس کو پاس بیٹھنے کی اجازت دی، سلمہ بیٹھی ہوئی تھی اور یہ محسوس کر رہی تھی کہ احمد کی ہر نگاہ کے ساتھ تحلیل ہوئی جاتی ہے اور اس کا ضمیر ملامت کر رہا تھا کہ کیوں اس نے مراد کے ساتھ جانے پر رضامندی ظاہر کر کے اپنے مالک کو دھوکہ دینے پر آمادگی ظاہر کی، اس کا فیروزی رنگ کا ریشمی ملبوس شانہ و گردن کے بلور و گلاب سے مل کر عجیب کیفیت پیدا کر رہا تھا، چہرہ کا رنگ غیر معمولی طور پر رخساروں میں جمع ہو کر آگ بنا ہوا دہک رہا تھا اور احمد نہایت غور سے کام لے کر اُس کے جذبات سمجھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ تھوڑی دیر گزر جانے کے بعد احمد نے کہا: "مجھے امید ہے کہ تمھیں میرے گھر میں کوئی تکلیف نہ پہونچی ہوگی"۔

سلمہ - "تکلیف! نہیں تو مجھے کوئی نہیں ہوئی"۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی اور اضطراری طور پر اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے۔ احمد نے اس سے کچھ گانے کی فرمائش کی اور اُس نے عود لے کر اپنی کانپتی ہوئی آواز سے تھوڑی دیر تک ناکام سعی کی، احمد اس وقت سلمہ کی اس حیا آمیز ادا سے اس درجہ متاثر ہوا کہ بیتاب ہو کر اس نے اپنا ہاتھ اس کے شانہ پر رکھ دیا اور زیادہ قریب ہو کر اس کا مطالعہ کرنا چاہا، لیکن سلمہ جس کے دل میں اس وقت تک مراد کی محبت کی آگ روشن تھی جھجک کر علٰحدہ ہو گئی اور احمد کو چند لمحات کے لئے متحیر کر دیا، چونکہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہ کر سکتا تھا کہ حرم سرا کی کوئی عورت اس سے احتراز و اجتناب کر سکتی ہے، اس لئے اس نے خیال کیا کہ شاید وہ نکاح پر راضی نہیں ہے اور اس نے نہایت فراخدلی سے کہا کہ "سلمہ، ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں نے تمھیں یہاں اس لئے نہیں بلایا ہے کہ تم کو محبت کرنے پر مجبور کروں، کیونکہ اس کا تعلق جبر و اکراہ سے نہیں ہے، چونکہ اب میں بالکل تنہا ہوں اور میرا جی چاہتا ہے کہ کوئی میری تنہائی کو دور کرے، اس لئے میں نے تمھیں بلایا ہے کہ اگر تم مجھ پر اس قدر مہربانی روا نہیں رکھ سکتیں تو میں تمھیں مجبور نہ کروں گا۔ تم آزاد ہو"۔

یہ سننے کے بعد سلمہ اس قدر متاثر ہوئی کہ اس نے اپنا سارا راز ظاہر کر دینا چاہا، لیکن پھر اس خیال سے کہ احمد اتنی بڑی غلطی کو معاف نہ کریگا اس نے ضبط کیا اور اس کا یہ ضبط گریۂ بے اختیار میں تبدیل ہو گیا۔

(۳)

ایک ہفتہ گزر چکا ہے اور سلمہ بالکل آزاد اپنے حال پر چھوڑ دی گئی ہے، نہ احمد نے اسے بلایا اور نہ مراد نے منہ دکھایا، اس کے لئے اب دُنیا بالکل ویران تھی اور کسی تفریح میں اس کا جی نہ لگتا تھا، رات کو آسمان کا ایک ایک تارا جو اس سے قبل اس سے گفتگو کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا، اب اسے برہم نظر آتا تھا، باغ میں بلبل کا لحن جو اس سے پہلے اس کے اندر ایک لذت پیدا کرتا تھا، اب اس کو ایک کراہ معلوم ہوتا تھا، مجلسرا کی فضاء جو پہلے اس کے لئے نشاط گاہ کا حکم رکھتی تھی، اب اس کو ماتم کدہ دکھائی دیتی تھی غرضیکہ وہ ہر چیز کو اپنے سے متنفر دیکھتی تھی اور دمشق کا ایک ایک ذرہ اُسے دیوانہ بنائے دیتا تھا، کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ اس نے احمد کی محبت کو رد کر کے ایسا معمولی گناہ نہیں کیا ہے جس کو فطرت معاف کر دے گی۔

ایک شام جبکہ افق کا قرمزی رنگ ہلکا ہو چلا تھا اس کے مقابل پورا چاند اپنا سوگوار چہرہ لیکر نمودار ہوا، سلمہ بیتاب ہو گئی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس زندگی سے مرجانا بہتر ہے، کیونکہ اگر وہ احمد کو چھوڑ کر مراد کے ساتھ چلی گئی تو بھی اس کا ضمیر چین سے نہ بیٹھنے دے گا،

اس لئے وہ فرش پر گر کر رونے لگی اور بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا کہ "اے خدا مجھے اُٹھا لے کیونکہ میں اپنے مالک و آقا کی بے رخی کو برداشت نہیں کر سکتی"۔
ایک کنیز جو باہر پردہ کے پاس بیٹھی ہوئی سُن رہی تھی، فوراً اُٹھ کر احمد کے پاس گئی اور اس سے سارا حال بیان کر دیا۔

(۴)

تمام حرم سرا میں ہر جگہ چہل پہل نظر آ رہی ہے، ذرہ ذرہ سے مسرت و نشاط پیدا ہے، کیونکہ سلمہ آج دولہن بنائی جا رہی ہے وہ گلاب سے نہلائی گئی۔ صحرائے شام کے جنگلی خوشبودار پھولوں سے اس کے بال سنوارے گئے، زرکار لباس سے اُسے آراستہ کیا گیا اور ایک کنیز عطریات لینے کے لئے بازار دوڑی گئی ۔ لیکن عین اس وقت جبکہ وہ کنیز، عطار سے احمد اور سلمہ کے باہم نکاح کا قصہ بیان کر رہی تھی، مراد بھی کسی غرض سے اُس کی دوکان پر آیا تھا اور یہ حال سنتے ہی غائب ہو گیا۔
سلمہ ایک منور کمرہ میں سونے کی زنجیر گلے میں ڈالے ہوئے آئینہ دیکھ رہی، اس کے سیاہ بالوں میں ذرات افشاں، تاریک رات کے ستاروں کی طرح چمک رہے تھے، ابرو کا وسمہ اس کے گورے گورے رنگ میں ان تلواروں کے خم کو پوری طرح نمایاں کر رہا تھا وہ پوری طرح آراستہ ہو چکی تھی اور صرف کنیز کا انتظار کر رہی تھی کہ عطر گلاب لا کر اس کے جسم میں ملا دے۔ کہ وہ کنیز بھی آ گئی اور سلمہ خوابگاہ عروسی کی طرف لیجائی گئی ۔

(۵)

احمد کا کمرہ روشنی سے جگمگا رہا تھا اور چاند کی روشنی نے اسے سیلاب نور سے لبریز کر دیا تھا، کھڑکیاں جن پر ہر وقت پردہ پڑا رہتا تھا اس وقت ہوا آنے کے لئے کھول دی گئی تھیں۔ گلاب و یاسمین کے خوشبو بیچے باغ سے آ آ کر سارے مکان کو معطر بنائے ہوئے تھی اور احمد فرش پر تکیہ کے سہارے خاموش بیٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔
سلمہ۔ آہستہ آہستہ شرمائے ہوئے قدموں کے ساتھ اس کی طرف بڑھ رہی تھی کہ وہ اس کی پذیرائی کے لئے اُٹھ کھڑا ہوگا، لیکن احمد نے بالکل پروا نہ کی اور وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ چونکہ روشنی بہت تیز تھی اور اُسے احمد کی صورت اچھی طرح نظر آتی تھی اس لئے سلمہ نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر لیا اور پھر آہستہ آہستہ بڑھی۔ وہ قریب پہونچ گئی اور اس نے جھک کر اس کے قدموں کو بوسہ دیا، لیکن پھر بھی اس میں حرکت نہ پیدا ہوئی۔
احمد کا چہرہ اس وقت ایسا نظر آتا تھا جیسے کسی پتھر میں تراشا گیا ہے اور اس کا رنگ بالکل نچوڑ دیا گیا ہے اس کی کھلی ہوئی آنکھیں سلمہ کی طرف جمی ہوئی تھیں اور اسی حال پر قایم تھیں، وہ اس کے قدموں میں تھی، لیکن اس کا شوہر اس کی طرف سے بے نیاز تھا، اور کسی تمنا کا اظہار نہ کرتا تھا۔ سلمہ متحیرانہ طریقہ سے اسے دیکھ رہی تھی کہ اس کی نگاہ سینہ پر پڑی جہاں ایک سُرخ دھبہ نظر آ رہا تھا اور نیچے فرش پر خون بہ کر جم گیا تھا، زیادہ غور کرنے سے اس نے اس خنجر کو بھی دیکھ لیا جو اس کے سینہ میں پیوست تھا اور پھر بیہوش ہو کر وہیں گر پڑی۔

(۶)

سلمہ ۔ "مراد، تم یہاں کیسے آئے اور کیوں ؟"
مراد ۔ "میں ان کھڑکیوں سے چڑھ کر یہاں آیا تاکہ تمہیں لیجاؤں اور اس شخص کو ہلاک کر دوں، جو تم کو چھین لینا چاہتا تھا"۔
سلمہ ۔ "شاباش، مرد ایسا ہی کیا کرتے ہیں اور میں تمہارے ساتھ چلنے کے لئے آمادہ ہوں، لیکن چونکہ احمد نے میرے ساتھ بہت سے احسانات کئے ہیں، اس لئے مجھے اتنی اجازت دو کہ ایک بار قریب سے اس کی لاش کو اور دیکھ لوں"۔
مراد ۔ "اجازت ہے، لیکن جلدی کرو، مبادا کوئی آجائے اور پھر ہم تم دونوں مارے ڈالے جائیں"۔
مراد نے یہ کہکر دروازہ کی طرف منہ پھیرا ہی تھا کہ وہی خنجر جو احمد کے سینہ میں پیوست تھا، اب مراد کی پشت سے گزر کر اس کے دل کا خون پی رہا تھا اور سلمہ ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اس کے تڑپنے کا تماشہ دیکھ رہی تھی۔

ق

لڑائیوں کی پیشین گوئیاں

دُنیا میں دو قسم کے اضطرابات رونما ہوتے رہتے ہیں، ایک طبعی دوسرے اجتماعی، اضطرابات طبعی زلزلہ یا زمین کے پھٹ جانے یا اسی قسم کے دوسرے غیر معمولی طبعی حوادث سے عبارت ہیں اور اجتماعی اضطرابات سے مقصود لڑائیاں، بغاوتیں اور دنیا کی قوموں کی باہمی کشمکش ہے۔

دنیا میں جب کبھی کوئی طبعی یا اجتماعی تغیر پیدا ہوتا ہے تو اس سے قبل اس کے متعلق پیشین گوئیاں ہونے لگتی ہیں، یہ پیشین گوئیاں کسی واقعہ کی ابتدا اور انتہا دونوں کے متعلق کی جاتی ہیں اور جب کوئی واقعہ طول اختیار کرتا ہے تو لوگ اُس سے تنگ آکر اس قسم کی باتوں کی طرف زیادہ توجہ کرنے لگتے ہیں، چنانچہ اسی قاعدہ کے مطابق جنگ عظیم کے دوران میں بھی متعدد پیشین گوئیاں کی گئی تھیں، اور جس قدر لوگ جنگ سے گھبراتے جاتے تھے اسی قدر پیشین گوئیاں کثرت سے بیان کی جاتی تھیں، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ پیشین گوئی صحیح ہوا کرے، یا کسی واقعہ کے ختم ہونے کی صحیح مدت اُس سے دریافت ہو سکے، اگر جنگِ عظیم کے شروع ہونے سے پہلے انسان کو یقینی طور پر معلوم ہو جاتا کہ یہ جنگ سات آٹھ سال تک طول پکڑے گی تو اس وقت لوگوں کی جو حالت ہوتی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

پیشین گوئیوں کی چند قسمیں ہیں جن میں سب سے زیادہ اعلیٰ الہامی پیشین گوئی ہے اور سب سے کم درجہ کی وہ پیشین گوئی ہے جو کسی واقعہ کے مقدمات دیکھ کر اُس کے متعلق کی جاتی ہے۔

اس مضمون کا موضوع الہامی پیشین گوئیوں اور ان کی تحقیق نہیں ہے بلکہ صرف ان پیشین گوئیوں پر نظر ڈالنا ہے جو اس جنگ کے متعلق کی گئی تھی اور یہ بھی اس غرض سے نہیں کہ ہم اُن کی صحت کے معترف ہیں بلکہ محض بر سبیل تفریح ان کا ذکر کرتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ جنگ عظیم کی پیشین گوئیوں کا ذکر کیا جائے ہم تین اہم پیشین گوئیوں کا ذکر کرتے ہیں جن کے متعلق ذرا بھی شک نہیں ہے کہ وہ واقعات سے پہلے کی گئی تھی۔ یہ تینوں پیشین گوئیاں بغاوتِ فرانس کے متعلق تھیں اور بغاوت فرانس سب سے قریب ترین عظیم الشان تاریخی واقعہ ہے جو بڑی حد تک گزشتہ جنگ عظیم کے اسباب میں اثر رکھتا ہے۔ یہ پیشین گوئیاں فرانس کے رسالہ لاروس میں شائع ہوئی تھیں۔

پہلی پیشین گوئی ۱۴۱۴ء میں کی گئی تھی، یہ پیشین گوئی (Pierre Ailly) کی کتاب میں لکھی تھی پیشین گوئی کے الفاظ یہ تھے

"بڑے عظیم الشان اور دہشت خیز انقلابات رونما ہوں گے جن کو زیادہ تر قوانین مذہبیت و مذاہب سے تعلق ہوگا"

جنگ سے پہلے کتاب مذکور کا قلمی نسخہ شہر ڈوائے (Douai) میں محفوظ تھا اور یہی پیشین گوئی بعینہ پیر ڈلی کی دوسری کتاب میں لکھی ہے جو مرسیلیا کے کتب خانے میں محفوظ ہے اور ۱۴۱۴ء میں کی گئی ہے۔

دوسری پیشین گوئی رچرڈ رومسار (Richard Roussat) کی ہے یہ بھی ایک کتاب میں لکھی ہوئی تھی۔ اس پیشین گوئی کی عبارت حسب ذیل ہے:

"۱۷۸۹ء میں اور اُس کے ۲۵ سال بعد (۱۸۱۴ء) میں دنیا کے قوانین اور مذاہب میں عظیم انقلابات اور تغیرات رونما ہونگے"

تیسری پیشین گوئی نسٹراڈامس (Nostradamus) نے کی تھی یہ شخص ہنری ثانی کا خاص ڈاکٹر تھا۔ اس پیشین گوئی کی تاریخ کتابت ۱۵۰۶ء ہے اس میں بمقابلہ دونوں سابق پیشین گوئیوں کے یہ اضافہ ہے۔

"بغاوت کے انقلابات ۱۷۹۲ء میں نہایت شدید ہوں گے اور اسی سال سے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا"

فی الواقع یہ اضافہ بھی حرف بحرف صادق آیا کیونکہ بغاوت فرانس اس سال اپنے شباب پر تھی اور سنہ مذکور عہد بغاوت کا پہلا سال شمار کیا جاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کونسی قوت ہے جس کی بنا پر پیشین گوئی کرنے والے مستقبل کے واقعات بتا دیتے ہیں، کیا حقیقت میں یہ غیب داں ہیں، یا اس کے کچھ اور اسباب ہیں۔ اس سوال کے متعدد جوابات دئے گئے ہیں جن کی بنا مختلف نظریات پر ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تمام نظریات ایسے مقدمات پر مبنی ہیں جو علمی حیثیت سے صحیح نہیں ہیں۔ ہم یہاں ایک نظریہ کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

حوادثِ عظیم کے اسباب کئی صدیوں کے بعد فراہم ہوتے ہیں ان اسباب میں پوشیدہ طریقہ پر پختگی حاصل ہوتی جاتی ہے اور ایک طویل مدت کے بعد وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ وہ ایک عظیم الشان انقلاب کا سبب بن سکیں۔

حوادث طبعی مثلاً زلزلے یا زمین کا پھٹنا، آگ اور گیسوں کے عمل سے پیدا ہوتا ہے جو زمین کے اندر پائے جاتے ہیں۔ اس لئے یہ بالکل آسان ہے کہ انسان ایسے آلات اختراع کرے جس سے اندرونی گیسوں کی رفتار معلوم ہوتی رہے اور زلزلہ یا زمین پھٹنے سے پہلے اس کے متعلق خبر دی جا سکے۔

جس طرح یہ طبعی حوادث خاص اسباب کے تحت پیدا ہوتے ہیں اور انسان دقیق آلات اختراع کرکے پہلے سے بتا سکتا ہے کہ فلاں وقت زلزلہ آئے گا یا زمین پھٹے گی اسی طرح اجتماعی حوادث اُن پوشیدہ اسباب کے تحت میں رونما ہوئے ہیں جو آہستہ آہستہ نفوس بشری پر اپنا اثر کرتے جاتے ہیں اور جب یہ اسباب جن کا اثر براہ راست انسانی نفوس پر پڑتا ہے پختہ ہو جاتے ہیں ان سے عظیم الشان انقلابات اور تغیرات پیدا ہوتے ہیں اور جس طرح انسان آلات کے ذریعہ سے زلزلے کے اسباب پہلے سے معلوم کرکے اُس کے متعلق پیشین گوئی کر سکتا ہے اسی طرح بعض آدمیوں میں اس کی قابلیت ہوتی ہے کہ وہ اُن پوشیدہ اسباب کی رفتار معلوم کر لیتے ہیں جو نفوس انسانی میں آہستہ آہستہ اپنا اثر کر رہے ہیں۔ یہ لوگ اپنی فطری اور قابلیت سے اسباب مذکورہ دیکھتے ہوئے بتا سکتے ہیں کہ فلاں وقت ایسا واقعہ رونما ہونے والا ہے۔

بعض لوگ اعداد و حروف کے خواص کے قایل ہیں وہ اپنے اصول کے مطابق بعض وقت ایسے نتائج نکالتے ہیں جن کو دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے، چنانچہ ایک شخص نے فرانس اور پروشیا کی جنگ کے آغاز اور انتہائی سنہ جمع کرنے سے نکالی تھی۔ یہ لڑائی جولائی ۱۸۷۰ء سے شروع ہو کر جنوری ۱۸۷۱ء میں ختم ہوئی، جنگ کے آغاز اور اختتام کی تاریخ اس طرح نکلتی ہے ۱۸۷۰+۱۸۷۱ = ۳۷۴۱، اب اس مجموعہ کو بائیں طرف سے پڑھئے، پہلے تین کا ہندسہ ہے پھر سات کا، چنانچہ جنگ بھی تیسری تاریخ اور ساتویں مہینہ میں شروع ہوئی، اس کے بعد چار اور ایک کا عدد ہے اور جنگ بھی پہلے مہینہ کی چوتھی تاریخ کو ختم ہوئی تھی۔

ایک اور پیشین گوئی = سنہ ۱۸۴۹ء میں ولیم اول (قیصر کا دادا) پروشیا کا ولی عہد تھا، اتفاقاً ایک روز وہ نیا لسبرگ کے قصبہ میں گیا جہاں ایک مشہور کاہنہ رہتی تھی، ولی عہد لباس بدل کر اس کے پاس پہونچا کاہنہ نے اُسے بشارت دی کہ وہ ایک روز بادشاہ ہو جائے گا ولیم نے پوچھا کہ میں کب بادشاہ ہوں گا اُس نے کہا کہ آجکل سنہ ۱۸۴۹ء ہے اس لئے اس سنہ میں اس کے اعداد انفرادی طریقہ پر اس طرح جمع کرنے چاہئیں ۱۸۴۹ + ۹ + ۴ + ۱ = ۱۸۷۱، اعداد کا مجموعہ یعنے ۱۸۷۱ تمھاری تخت نشینی کا سنہ ہے اور حقیقت میں بھی ولیم اول سنہ ۱۸۷۱ء جرمنی کا بادشاہ ہوا پھر ولیم نے اُس سے پوچھا کہ میں کتنے عرصہ تک حکومت کروں گا، اُس نے کہا کہ سنہ ۱۸۷۱ء کا انفرادی مجموعہ اُس کے ساتھ جمع کرو، جمع کرنے سے جو کچھ حاصل ہوگا وہی تمھاری موت کا سنہ ہے یعنی (۱ + ۷ + ۸ + ۱ = ۱۷ + ۱۸۷۱ = ۱۸۸۸) اور فی الواقع سنہ ۱۸۸۸ء میں ولیم کا انتقال ہوا پھر اس نے سوال کیا کہ میری سلطنت کب تک قایم رہے گی اُس نے کہا سنہ ۱۸۸۸ء کے انفرادی مجموعہ کو اُس کے ساتھ جمع کرو یعنی ۸ + ۸ + ۸ + ۱ = ۲۵ + ۱۸۸۸ = ۱۹۱۳، اور حقیقت میں سنہ ۱۹۱۳ء میں جرمنی شاہنشاہیت کے آثار سقوط پیدا ہونے لگے۔

منجملہ ان عجیب پیشین گوئیوں کے جو اس جنگ کے متعلق کی گئی ہیں۔ کاہنہ روڈیل کی پیشین گوئی ہے۔ پیشین گوئی ساتویں صدی میں کی گئی تھی۔ اوڈریل ڈیوک الزرس کی بیٹی تھی۔ اس کی پیشین گوئی لاطینی زبان میں ہے اس میں صراحتاً ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ سلطنت بالکل تباہ

ہوجائے گی جو اس کی جائداد پر تصرف کرنا چاہے گی، جس لڑائی کا ذکر اس پیشین گوئی میں کیا گیا ہے، اس کے حالات بالکل گزشتہ جنگ پر منطبق ہوتے ہیں۔ اس پیشین گوئی میں ہوائی جہازوں اور آبدوزوں کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔

جنگ کی پیشین گوئیوں میں ایک عجیب و غریب پیشین گوئی (۱۷۸۸ء میں) امریکہ کے ایک اخبار میں شایع ہوئی تھی۔ اس پیشینگوئی کا تعلق بادشاہوں کے سنین ولادت، سنہ جلوس اور مدت حکومت کے اعداد پر مبنی ہے اور جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دول متحدہ کے تمام فرمانرواؤں کے سنین ولادت وغیرہ جمع کرنے سے سب کا حاصل جمع ایک ہی ہوجاتا ہے۔ ذیل میں اس کی تفصیل درج کرتے ہیں:

ولسن (پریسیڈنٹ امریکہ)	
پیدایش	۱۸۵۶ء
تاریخ انتخاب صدارت	۱۹۱۳ء
مدت حکومت	۴
عمر	۶۱
مجموعہ	۳۸۳۴
شاہ انگلستان	
ولادت	۱۸۶۵ء
تخت نشینی	۱۹۱۰ء
مدت حکومت	۷
عمر	۵۲
مجموعہ	۳۸۳۴
صدر جمہوریہ فرانس	
پیدایش	۱۸۵۸ء
تاریخ انتخاب	۱۹۱۳ء
مدت حکومت	۴
عمر	۵۹
	۳۸۳۴
شاہ بلجیم	
پیدایش	۱۸۷۵ء
تخت نشینی	۱۹۰۹ء
مدت حکومت	۸
عمر	۴۲
	۳۸۳۴
شاہ سرویا	
پیدایش	۱۸۴۴ء
تخت نشینی	۱۹۰۳ء
مدت حکومت	۱۴
عمر	۷۳
	۳۸۳۴
شاہ سرویا	
پیدایش	۱۸۶۵ء
تخت نشینی	۱۹۱۴ء
مدت حکومت	۳
عمر	۵۲
	۳۸۳۴
شاہ اطالیہ	
پیدایش	۱۸۶۹ء
تخت نشینی	۱۹۰۰ء
مدت حکومت	۱۷
عمر	۴۸
	۳۸۳۴
جاپان	
پیدایش	۱۸۷۹ء
تخت نشینی	۱۹۱۲ء
مدت حکومت	۵
عمر	۳۸
	۳۸۳۴
شاہ مانٹی نگرو	
پیدایش	۱۸۴۱ء
تخت نشینی	۱۹۱۰ء
حکومت	۷
عمر	۵۲
	۳۸۳۴

اس میں سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جب اس مجموعہ کو نصف کرتے ہیں تو ۱۹۱۷ حاصل ہوتا ہے جس سنہ میں یہ پیشین گوئی کی گئی تھی۔

بظاہر یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقتاً یہ صرف ریاضی کی ترکیب ہے، کیونکہ جب آپ کسی بادشاہ کا سنہ ولادت اور اس کی موجودہ عمر کو جمع کریں گے تو سنہ حاضر نکل آئے گا۔ اسی طرح تاریخ تخت نشینی اور مدت حکومت کا مجموعہ وہی ہوگا، پھر چونکہ ۱۹۱۷ء میں ان دونوں کو یکجا کر دیا گیا اس لئے مجموعہ ۳۸۳۴ ہوا جو ۱۹۱۷ء کا دوچند ہے۔

ایک پیشین گوئی ۱۷۹۳ء میں جاپان کے کسی شخص نے کی تھی کہ "جب انسان پرندوں کی طرح اڑنے لگے گا تو دس بادشاہ آپس میں برسر جنگ نظر آئیں گے اور تمام دنیا اس سے متاثر ہوگی۔

ٹالسٹائی کی پیشین گوئی بھی بہت مشہور ہے۔ لیکن وہ اس قدر صاف و صریح نہیں ہے کہ بغیر تاویل کئے ہوئے گزشتہ جنگ پر منطبق ہو سکے

"نگار" کے پچھلے فائل

سنہ ۳۲ء	=	جولائی تا دسمبر	=	——— = عہ ۱۰ر
سنہ ۳۶ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ ہندی شاعری نمبر) = عہ ۲۰ر
سنہ ۳۷ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ اصحاب کہف و خلافت نمبر) = عہ ۲۰ر
سنہ ۳۹ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ مصحفی نمبر) = عہ ۲۰ر
سنہ ۴۰ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ نظیر نمبر) = عہ ۲۰ر
سنہ ۴۴ء	=	جولائی تا دسمبر	=	——— = عہ ۱۰ر
سنہ ۴۶ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ انتقاد نمبر) = عہ ۲۰ر
سنہ ۴۷ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ ماجدولین نمبر) = عہ ۲۰ر
سنہ ۴۹ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ افسانہ نمبر) = عہ ۲۰ر
سنہ ۵۰ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ تنقید نمبر) = عہ ۲۰ر
سنہ ۵۲ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ حسرت نمبر) = عہ ۲۰ر
سنہ ۵۳ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ داغ نمبر) = عہ ۲۰ر

نوٹ :- صرف ایک ایک فائل موجود ہے اور سب سے پہلے جس کا آرڈر پہونچے گا اسی کو دیا جائے گا - قیمت محصول ڈاک کے علاوہ ہے -

منیجر نگار لکھنؤ

نومِ طویل

جنگ عظیم کے دوران میں ایک مرتبہ شمل گوز فرانسیسی فوج کے قریب آکر گرا جس کے ٹکڑوں سے بہت سی جانیں تلف ہوگئیں اور مجروحین کو شفاخانوں میں علاج کی غرض سے بھیجا گیا، اُن میں ایک ایسا شخص بھی تھا جس کے جسم پر کوئی زخم نہیں لگا تھا، مگر گولہ پھٹتے ہی وہ ایک گہری نیند سو گیا تھا۔

طویل عرصہ تک سو جانا کوئی نئی بات نہیں ہے اس سے پہلے صدہا واقعات نومِ طویل کے گزر چکے ہیں، مگر اس سپاہی کی نیند نے بہت زیادہ طول کھینچا، کچھ دنوں بعد وہ سپاہی ایک ہسپتال میں لایا گیا، وہ برابر سو رہا تھا واقعہ مذکورہ کے اکیس ہفتہ کے بعد وہ بورڈو کے شفاخانہ میں لایا گیا، جہاں عصبی امراض کا خاص طریقہ پر علاج ہوتا ہے، اس کے بعد جنوری کے مہینہ میں یعنی ۲۹ مہینے کے بعد وہ پیرس بھیجا گیا، جہاں اُس سونے والے کا مکان تھا، اس طویل خواب کے زمانہ میں اُس کی عورت اس کی خدمت کرتی رہی، اس کے بعد اُسکا حال معلوم نہیں ہوا کہ وہ اپنے خواب راحت سے بیدار ہوا یا ابھی اس کی نیند پوری نہیں ہوئی ہے۔ لیکن اتنا ضرور سنا گیا تھا کہ اب اسکی نیند پہلے کی طرح گہری نہیں رہتی ہے۔

یہ سب سے آخری واقعہ ہے جو نومِ طویل کے متعلق اس عہد میں سامنے آیا ہے اس سے پہلے اطبا نے متعدد واقعات گہری نیند کے بیان کئے ہیں، جس کے مقابلہ میں اس سپاہی کی نیند خفیف سے قیلولہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، کیونکہ زمانۂ ماضی میں بہت سے ایسے سونے والے گزرے ہیں جو کئی سال تک محوِ خواب رہے، مرگریٹ ایک فرانسیسی عورت ۲۷ سال تک سوتی رہی۔

اس خوفناک حوادث کا شکار اکثر عورتیں ہوتی ہیں جن کے عصبی نظام میں کوئی زبردست خلل پیدا ہوجاتا ہے طویل نیند سونے والوں کی تاریخ حیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی سخت مرض میں مبتلا ہوگئے تھے ان کے اعصاب میں اضطراب اور تہیج پایا جاتا تھا اور انھیں دماغی دورے ہوتے تھے۔

بعض لوگ متعدد مرتبہ طویل نیند میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور ہر مرتبہ بعد کی نیند پہلے سے زیادہ طویل ہوتی ہے، اکثر اوقات یہ کیفیت کسی خارجی واقعہ سے پیدا ہوتی ہے جس سے دماغ متاثر ہوجاتا ہے اور بعض صورتوں میں محض داخلی سبب کی بنا پر نومِ طویل واقع ہوجاتی ہے۔

سب سے زیادہ عجیب تر یہ بات ہے کہ بعض لوگوں کو سالانہ ایک خاص زمانہ میں نومِ طویل کا دورہ ہوتا ہے ماریا البون جو اٹھارویں صدی کی ایک خاتون ہے اسی مرض میں مبتلا تھی، پہلی مارچ سے ۱۹ مارچ کی آدھی رات تک یہ دورہ رہتا تھا، چونکہ وہ اسکی عادی ہوگئی تھی اس لئے ایک دن پہلے اس کا اہتمام کرتی تھی معمولی لباس اُتار کر سفید کپڑے پہن لیتی تھی اور صلیب سینہ پر رکھ کر نومِ طویل کی پذیرائی کے لئے تیار ہوجاتی تھی اور وقت معین پر اُسے نیند آجاتی تھی۔

اس قسم کی طویل نیند سونے والوں کی حالت تقریباً یکساں ہوتی ہے، سب پر ایک مکمل سکون و جمود طاری ہوجاتا ہے اور ہر خارجی شے سے متاثر نہیں ہوتے، یہاں تک کہ اگر ان کی زبان پر تلخ ترین دوا رکھی جائے تو بھی انھیں خبر نہیں ہوتی البتہ عضلات بعض وقت سخت اور کبھی نرم ہوجاتے ہیں۔ کبھی جسم اس قدر زار اور لاغر ہوجاتا ہے کہ دیگر امراض اس پر حملہ کر دیتے ہیں۔

طویل نیند سونے والوں کی غذا

انسانی حیات کی حفاظت کے لئے کچھ نہ کچھ غذا کا ہونا لازم ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ طویل نیند والوں کو غذا کی ضرورت پیش نہیں آتی اور وہ بغیر کھائے پئے مدتوں تک زندہ رہتے ہیں بعض سونے والے اس قسم کے ہیں جنھیں کچھ نہ کچھ غذا دی جاتی ہے جو اکثر چند چمچے دودھ یا انڈے کی زردی یا اسی قسم کی اور کوئی لطیف غذا ہوتی ہے، ان سیال غذاؤں کو سونے والا اکثر اوقات نگل لیتا ہے، اور یہی اُس کے تغذیہ کے لئے کافی ہوتی ہیں، بعض صورتوں میں ایسے سونے والے کے معدہ میں خاص قسم کی نلکیوں کے ذریعہ سے غذا پہونچائی جاتی ہے، بعض مریض ایسے ہوتے ہیں کہ تیسرے چوتھے دن کھانا اُن کے لئے کافی ہوتا ہے لیکن بعض سونے والوں کے عضلات میں تشنج ہونے کی وجہ سے اُن کا منہ نہیں کھل سکتا ایسے لوگوں کو غذا دینے میں سخت دشواری پیش آتی ہے، ایسی حالت میں ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ قوت سے اُن کا منہ کھول جائے، چنانچہ ایک مریضہ کا منہ آلات کے ذریعہ سے کھولا گیا، مگر پھر وہ بند نہ ہو سکا۔

بعض سونے والے ایسے ہوتے ہیں جو مطلقاً غذا نہیں کھاتے، چنانچہ ماریان اولیون جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔ اپنے اُنیس دن کے دورۂ خواب میں کوئی چیز نہ کھاتی تھی، لیکن سب سے زیادہ تعجب خیز حالت ایک اسپینی عورت کی تھی اس کا نام لیتھیان تھا، ابتدا میں اُسے ضعف عقلی کا مرض لاحق ہوا، اور تدریجاً اُس کا مرض بڑھتا گیا پھر اُس پر ایک طویل سکون و جمود طاری ہو گیا لیکن یہ پُرسکون گہری نیند نہ تھی بلکہ وہ دیکھتی اور سنتی تھی اور جو کوئی اُس کے قریب جاتا تھا تو اپنا منہ چھپا لیتی تھی، تیس سال تک اُس کا یہی حال رہا، ابتدائی دس سال میں ہر روز اُس کے گھر والے چند چمچے دودھ اُسے پلا دیا کرتے تھے، لیکن اس کے بیس سال کے عرصہ میں خالص پانی کے سوا اُس کے منہ میں کچھ نہ گیا جس کی روزانہ مقدار ایک سو پچیس گرام سے زیادہ نہ تھی۔

ان واقعات کی سوا اس کے کچھ توجیہ نہیں ہو سکتی کہ جسمانی اور عقلی جمود عارض ہو جاتا ہے اور اعضا کی حرکت بالکل سکون کے قریب ہو جاتی ہے اس لئے انسان کی احتیاج غذا کی طرف بہت کم ہوتی ہے اور تغذیہ کے لئے وہ چربی کافی ہوتی ہے جو انسان کے بدن میں موجود ہے، یہی سبب ہے کہ اس قسم کی نوم طویل کے بعد سونے والا کمزور ہو جاتا ہے۔

دباگنے کے بعد ان کی کیا حالت ہوتی ہے

جو لوگ تھوڑے عرصہ تک سو کر اُٹھتے ہیں وہ بالکل اسی طرح بیدار ہوتے جس طرح معمولی نیند کے بعد انسان جاگ اُٹھتا ہے، ماریان اولیون جو ۱۹ دن کے بعد بیدار ہوتی تھی اسے جاگتے وقت ایک چھینک آیا کرتی تھی، لیکن اس طویل خواب کے بعد حد درجہ ضعف اس پر طاری ہو جاتا تھا، یہاں تک کہ اُس کی آواز مشکل سے سنائی دیتی تھی، سوتے وقت اس کا منہ باندھ دیا جاتا تھا تاکہ خشک نہ ہو جائے، جاگنے کے بعد اُسے میوے اور بادام وغیرہ کھلائے جاتے تھے اور چند روز کے بعد وہ پھر اچھی خاصی ہو جاتی تھی، بعض وقت اس قسم کے سونے والے کسی خارجی آواز سے بیدار ہو جاتے ہیں، ایک مرتبہ ایک عورت گھنٹوں کی آواز سے جاگ اُٹھی جو اُس کے محلہ میں آتشزدگی کی اطلاع کے لئے بجائے جا رہے تھے۔

طویل نیند سونے والے بیدار ہونے کے بعد اکثر مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور نہایت شاذ صورتوں میں ان کی اصلی قوت واپس آ سکتی ہے۔

وہ تمام وسایل جو ایک معمولی سونے والے کے بیدار کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں، نوم طویل کے حق میں غیر مفید ثابت ہوتے ہیں۔

سب سے زیادہ عجیب تجربہ اس مقصد کے لئے ایک ڈاکٹر نے کیا تھا جو ایک حد تک کامیاب ثابت ہوا، اُس نے اس بات کی کوشش کی کہ اس غیر طبعی نوم کو نوم طبعی بنایا جائے۔ چنانچہ اُس نے مریضہ کو نیند لانے والی دوائیاں سنگھانا شروع کیں وہ چاہتا تھا کہ اس طریقہ سے اُس کے نفس پر اثر ڈالا جائے، چنانچہ اُس کا عمل مفید ثابت ہوا اور سونے والی نیند سے اُٹھ بیٹھی مگر وہ کھانا پینا بالکل بھول گئی تھی،

بچوں کی طرح اسے اکل و شرب کی تعلیم دی گئی۔

نومِ طویل کیا چیز ہے

اگر ہم نومِ طویل کی یہ وجہ بیان کریں کہ اس قسم کی نیند کسی اعصابی خلل سے پیدا ہوتی ہے، تو یہ تعلیل مجہول کی مجہول کے ساتھ ہوگی، کیونکہ جب تک اس خلل کی تشریح نہ کی جائے وہ بھی مجہول ہے۔

ڈاکٹر پریلو فرانسیسی نے اس کی ایک نئی وجہ بیان کی ہے، وہ کہتا ہے کہ دماغ میں ایک مرکز ایسا ہے جو نیند کا مقابلہ کرتا ہے اور انسان کو سونے سے باز رکھتا ہے، بعض مخصوص حالات میں وہ مرکز کسی سبب سے فاسد ہو کر اپنا فعل چھوڑ دیتا ہے اور انسان سو جاتا ہے، پھر کوئی چیز اس کے بیدار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

لیکن ہمارے خیال میں نومِ طویل کی تعلیل بیان کرنے سے پہلے نومِ طویل اور معمولی سونے میں فرق کرنا ضروری ہے لیکن ابھی تک نومِ طویل کا کیا ذکر معمولی نیند کی حقیقت بھی اچھی طرح سمجھ میں نہیں آئی ہے۔

حضرت نیاز کا ایک خط

آپ بھی کیا داستان لے بیٹھے ـــــ اے حضرت، آج کل کافر و مسلمان دونوں کا ایک حال ہے، نہ اس کو شیوۂ کافری کا پاس نہ اس کو آئینِ مسلمانی کا لحاظ۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ:-

چراغِ کعبہ و بتخانہ بے پروا نہ می سوزد

دنیا بدل گئی، اس کا تمدن بدل گیا، عورت مرد ہو گئی، مرد عورت بن گیا اور آپ کو ہنوز اس پر اصرار ہے کہ: ریشِ دراز بھی ہو اور منت کش شانہ بھی!

دین و مذہب کے باب میں غالب اپنا فلسفہ ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے:-

سنگ و خشت از مسجد ویرانہ می آرم بہ شہر
خانۂ در کوئے ترسایاں عمارت می کنم

یعنی اگر کسی مذہب میں یہ قوت باقی نہیں رہی کہ وہ تعمیری نظام کو قایم رکھ سکے، تو مناسب یہی ہے کہ اس کی ویرانی پر کسی اور زندہ مذہب کی تعمیر شروع کی جائے

اب مذہب نام ہے صرف سیاست کا اور سیاست کی غایت ہے صرف صنعت و تجارت کی ترقی، اس لئے اگر آپ کو واقعی مذہبی نزاع سے دلچسپی ہے تو سرمایہ داری کی حمایت کیوں نہ کیجئے کہ تاریخ مذہب کے واقعات میں سے اب یہی ایک چیز دنیا کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ اب زمانہ "حی علی الصلوٰۃ" کی پکار کا نہیں بلکہ "حی علی الفعل" کا ہے

ما ہے کہ خضر داشت ز سرچشمہ در ربود
لب تشنگی ز راہ و گہر بردہ ایم!

لیکن آپ کیوں سمجھنے لگے؟

فنونِ لطیفہ اور علم الاخلاق

مختلف نقطہ ہائے نظر سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ "کیوں نہ صنعت (آرٹ) کو اصول اخلاق کے تابع رکھا جائے"، لیکن سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ ایسا ہو بھی سکتا ہے یا نہیں، جس حد تک تفکر و تدبر سے کام لیا جاتا ہے ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ایسا ممکن ہی نہیں ہے، یہ درست ہے کہ کبھی کبھی صنعت اصولِ اخلاق پر بھی حاوی ہو جاتی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ صنعت کا دائرہ اخلاق کے دائرہ سے بہت وسیع ہے، کیونکہ اس کا تعلق بالکل فطرت سے ہے اور وہ کچھ نہیں ہے مگر اک نتیجہ مظاہر فطرت کے مختلف نتائج و اثرات کا۔

اس لئے یہ سوال خواہ کسی شکل میں کیا جائے۔ تاہم فنونِ لطیفہ اور علم الاخلاق کا باہمی تعلق نہایت دلچسپ گو اُلجھا ہوا مبحث ہے، صنعت اک تخلیق ہے، اور اس لئے کسی ایسی شے کا پیدا کرنا ہے جو جدید ہو، بے عیب ہو، جو اپنے اندر صناع کا کوئی نشان رکھتی ہو یعنی کچھ ایسی چیز ہو جس سے یہ معلوم ہو کہ صناع نے اپنی روح کا کوئی جزو اس میں چھوڑ دیا ہے لفظ "صناع" میں شاعر، مصور، سنگ تراش افسانہ نگار وغیرہ سب شامل ہیں، وہ شخص جس نے کبھی کوئی چیز "تخلیق" نہیں کی، لیکن اپنے ذوق کے لحاظ سے اس کا اہل ہے، صناع کہلائے جانے کا مستحق ہے، علم الاخلاق کو جو تعلق "صنعت" سے ہے، یا جس حد تک اخلاقی احکام ایک صناع سے وابستہ ہو سکتے ہیں، اس کے متعلق غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علم الاخلاق کا صحیح دائرہ صرف "حیاتِ دُنیا" ہے لیکن وہ تصویر زندگی جسے فنونِ لطیفہ پیش کرتے ہیں کچھ اور چیز ہے، کٹیاس نے اس حقیقت کو ذرا وسعت کے ساتھ یوں ظاہر کیا ہے :-

"اگر شاعر خود اک صالحانہ زندگی بسر کرتا ہو تو اُس کی نظموں میں کچھ آزادی ضرور جائز رکھی جا سکتی ہے"

تخیل اور عمل میں باہم ایک قسم کا عناد پایا جاتا ہے، ایک صاحبِ فن کے اصول نفسیات صرف اسی کے لئے مخصوص ہوتے ہیں اور اگر ہم صرف فن کا علم حاصل کرنا چاہیں تو ہمیں اک صناع کے صرف زائیدہ دماغ کو دیکھنا چاہیئے اور اس پر کبھی غور کرنا چاہیئے کہ اسکے لئے لازم کیا تھا۔

کسی شخص نے کارلائل کے سامنے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ جرمنی کا سب سے بڑا شاعر گیوٹے اخلاقی معاملات میں ایک حد تک ملامت کے قابل تھا۔ کارلائل نے جواب دیا کہ یہ اعتراض ایسا ہی ہے جیسے اس بات کی شکایت کہ آفتاب تمہارے لئے پائپ کے تمباکو کو نہیں سلگاتا۔ گیوٹے میں اس قسم کے معائب کی مثال ایسی ہے جیسے آفتاب میں داغ۔

اگرچہ بعض ماہر صناع ایسے بھی تھے جو اخلاقی نقطۂ نظر سے بے عیب تھے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ صرف صاحبِ فن ہونے کی وجہ سے ایک شخص اکثر نیک خصلت بن جاتا ہے۔ ایک صناع کا مقصد زندگی کی تصویر کھینچنا ہے اور اس حیثیت سے کہ وہ اپنے کو صالح تر بنانے کی کوشش سے زیادہ قدرتاً اس بات کے معلوم کرنے کی جستجو کرتا ہے کہ زندگی کیا ہے اور اپنے سوا کسی کوئی شخص ایسا نہیں ملتا جس کی حقیقت کا وہ مکمل طور سے مطالعہ کر سکے۔ اُسے اُن جذبات سے جو اس کی فطرت میں پوشیدہ ہوتے ہیں اک دلچسپی ہوتی ہے اور اس دلچسپی کی وجہ سے وہ انھیں روکنے کی بجائے کامل آزادی دیدیتا ہے۔

اک صناع، بحیثیت صناع ہونے کے واقعات زندگی سے بالکل علحدہ ہو کر کام کرتا ہے، وہ انسانوں کو بغور دیکھتا ہے، وہ خود اپنا بھی مطالعہ کرتا ہے اور آخر کار اپنے آپ کو بھی اک دوسرا آدمی تصور کرنے لگتا ہے، جیسا والٹ وہٹمین کہتا ہے:

"میں اپنی شبیہ کے سایہ کو دیکھتا ہوں جو صول معاش کے لئے اِدھر اُدھر برزہ سرائی کرتے ہوئے خرید و فروخت کرتی پھرتی ہے"

ایک صناع اس کام کو جسے ہم سب کسی قدر کمی بیشی کے ساتھ کر سکتے ہیں، اعلیٰ پیمانہ پر کرتا ہے، تمام جلیل القدر شاعر اپنے گیتوں کی بنیاد جذبات اور کیفیات قلب پر رکھتے ہیں لیکن وہ اُسی وقت گیت طیار کر سکتے ہیں جب لمحۂ جذبات یعنے وفورِ جذبات کا نازک وقت گزر جائے جب ہم کسی غم کے متعلق اشعار پڑھتے ہیں تو اُس وقت وہ غم ختم ہو چکا ہوتا ہے یا اسوقت تک ہم اُس غم کو خاموشی سے برداشت کرنا سیکھ لیتے ہیں غرض ایک صناع اخلاق کے متعلق کسی قدر خاموش اور بے غرض ہوتا ہے اور اُس کے لئے یہ مشکل ہے کہ وہ مردوں اور عورتوں کے معائب سے بالکل ناراض ہو جائے، کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ یہی وہ چیزیں ہیں جو اُسے اپنے فن کے استعمال کا موقع دیتی ہیں، مثلاً ناول نگار اور ڈرامانویس بغیر بدکار لوگوں کے کیا کر سکیں گے؟ جس قصہ کے تمام اشخاص نیک خصلت ہوں گے، اُسے کون شوق سے پڑھے گا۔

میٹرلنک نے اپنے ایک پر تخیل اور معنی خیز الفاظ میں لکھا ہے کہ غمناک ڈراموں میں کبھی ایسی شخصیت نہیں پیش کی گئی جو مکمل طور سے عاقل ہو، کیونکہ غمناک واقعات پیدا ہوتے ہیں صرف انسانی جذبات و نقایص سے اور ڈراما میں اک عاقل شخص کی موجودگی اُن حالات کو جن سے غمناک نتائج پیدا ہونے والے ہوں روک دینے کے لئے کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈراما لکھنے والوں کے لئے جس قدر مواد اخلاقی کمزوریوں سے ملتا ہے اتنا فطرت انسانی کی دانائیوں سے نہیں۔

ہر چند بعض قدیم ناول نویسوں نے جو حقیقتاً صناع نہ تھے اپنی تصانیف کو بالکل علم الاخلاق کے تحت مرتب کیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُن میں حقیقی روح حسن صنعت کی موجود نہیں ہے، اسی کے ساتھ صنعت کو ملا کر دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بعض مذاہب صنعت کے مطابق ہیں اور بعض مخالف، لیکن مطابق وہی ہیں جو ہر نوع کے فن کو پیدا کرنے اور ترقی دینے کی کافی آزادی دیتے ہیں اور جن میں اصول اخلاق کا کوئی شدید ضابطہ موجود نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ بہ نسبت پروٹسٹنٹ مذہب کے زمانۂ وسطیٰ کا کیتھولک مذہب اور اسکی بت پرستی فنون لطیفہ سے زیادہ دلچسپی لیتی تھی ــ جس مذہب میں افعال نیک و بد کی تقسیم نہایت سختی سے کی جاتی ہے اُن سے صنعت بیزار ہو جاتی ہے۔

مسٹر واٹز اک ہوشیار نوجوان سے ملاقات تھی جو اپنی ہوشیاری کی وجہ سے اکثر مشکلات میں مبتلا ہو جاتا تھا، اُسے پیٹر وفی لیس کی کتاب "میٹری کون" کا مطالعہ نہایت مرغوب تھا، اُس نے روما کے اس قدیم و بدنام مصنف کو پسند کرنے کی وجہ یہ بیان کی کہ باوصف اس نکوہش و ملامت کے جو اس رند کے حالات زندگی پر عموماً کی جاتی ہے، اس کی تصانیف میں اک عظیم الشان بے خوف آزادی کا عالم نظر آتا ہے، اُس کے ناول میں شروع سے آخر تک کوئی خفیف سا اشارہ بھی یہ ظاہر نہیں کرتا کہ انسان پر اُس کے فعل کی وجہ سے ملامت کی جا سکتی ہے۔

اگر دنیائے ادب میں بعض اوقات ہم اُن زنجیروں کو دور کر دیں، جن سے "اندیشۂ ملامت" واقعی زندگی کو اک شدید قید میں مبتلا رکھتا ہے، تو کیا حرج ہے؟۔

زندگی میں ہم ہر شخص کو اس بات کا خطرناک اختیار دیا جاتا ہے کہ فرض یا آزادی میں سے ایک کو اپنے لئے منتخب کرے، مجبوراً ہم فرض ہی کو منتخب کرتے ہیں اور فرض ہی انتخاب کرنے والوں کی تعریف، اگرچہ واقعی زندگی میں اُن شکستہ حال، پیرہن دریدہ آوارہ لوگوں کی صحبت جنھوں نے آزادی کی تلاش میں اپنی زندگی برباد کر دی ہو، کسی معزز شخص کو مشکل گوارا ہوتی ہے، تاہم فنون لطیفہ کی دنیا میں بعض وقت ایسی صحبت میں وقت گزار دینا بہت پر لطف مشغلہ ہو جاتا ہے۔

ایک ماہر صناع کے قلب کی نہایت اہم خصوصیت "حسن" کی محبت ہے اور وہ اگر اخلاق تک پہونچ سکتا ہے تو صرف ذوق محبت کے ذریعہ سے۔ قدیم یونانیوں کے عقیدے کے مطابق ان کی زندگی کا نصب العین صرف "حسن" تھا، ہر چند اس نصب العین میں "نیکی" بھی شامل تھی، تاہم وہ اُسے بھی حسن ہی کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ اہل یونان اخلاقی مسایل کو بھی حقیقتاً کس نظر سے دیکھتے تھے، جو شے مفید ہو اُس میں اک نوع کا "حسن" ضرور ہونا چاہئے اور اس میں شک نہیں کہ اخلاق کے اصول نہایت مفید ہیں، اس لئے اخلاق میں ایک مخصوص حسن ہونا چاہئے۔ اک انسان کی باقاعدہ زندگی، جس میں وہ اپنی ہی عقل و احتیاط سے کام لے، حقیقتاً اک حسن ہے، لیکن وہ پابندی جو کوئی غیر قوت اُس پر عاید کرتی ہے، اک صناع کو ضرور قابل نفرت نظر آئے گی۔

لیکن باوجود ماہر جلیل القدر موجدہ شاعر اور صناع کو پیشکل دماغ سلیم رکھنے والا کہا جا سکتا ہے کیونکہ شاید کسی صناع کا دماغ کسی ایسے راہب و مقدس شخص کے برابر نہیں پہونچا، جو اپنی زندگی کو عقل و تمیز کے ماتحت رکھ کر اپنے قول و نصائح کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہے۔

ایک صناع کو اپنی زندگی کی لذتوں کا نہایت شدید احساس ہوتا ہے اور اُس کی طبیعت عموماً تغیر پذیر ہوتی ہے، وہ آزاد و بے تعصب جذبات کی پرورش کرتا ہے، جن کی وجہ سے وہ نیک و بد میں تمیز کر سکتا ہے، لیکن بہر حال وہ اُن نقائص سے آزاد نہیں ہوتا جو فطرت انسانی کے لئے ضروری ہیں اور جو ایک غیر صناع مقدس آدمی بھی پائے جاتے ہیں۔

اک مثل ہے کہ اگر دو شخص گھوڑوں پر سواری کر رہے ہوں تو ایک کو ضرور آگے ہو جانا چاہئے، چنانچہ صناع ہمیشہ فنون لطیفہ کو علم الاخلاق سے آگے رکھنا چاہئے اور ایک مصلح اخلاق، اخلاق کو پہلی جگہ دینے کا متمنی ہے، غرض اس طرح پر ان دونوں میں ایک ناگزیر مخالفت چلی آتی ہے اور جب تک صنعت، اپنی حقیقی روح کو زایل نہ کرے اُس وقت تک غالباً وہ اخلاق کے تحت کام نہیں کر سکتی۔

(ماخوذ)

غربت

تاریخ انقلاب حیدر آباد

یا

مشاہدات

تقسیم ہند کے بعد، تاریخ ہندوستان کا اہم ترین واقعہ "انقلاب حیدر آباد" تھا، جس کے صحیح تفصیلی حالات حکومت شایع نہ کر سکتی تھی اور اہل حیدر آباد میں کسی کو اس کی جرأت نہ تھی۔ پھر ٹھیک اسی وقت جبکہ ہندوستان کی تاریخ کا نیا ورق اُلٹا جا رہا تھا اور سلطنت مغلیہ کی آخری یادگار (حکومت آصفیہ دکن) کے نقوش مٹنے جا رہے تھے۔ جناب ہوش بلگرامی (نواب ہوشیار جنگ) جو حضور نظام کے خاص درباری اور حیدر آباد کے تمام سیاسی تار و پود کے ایک ایک ریشہ سے واقف تھے۔ اپنی آٹھ جلدوں میں مرتب کرنا شروع کی جس کا اصل مقصود یہ تھا کہ حیدر آباد کی سیاست، دربار آصفی کی سازشوں اور وہاں کی جماعت اتحاد المسلمین کی سرگرمیوں اور ریشہ دوانیوں کی صحیح و جامع تاریخ مرتب کر کے ایک ایسا ریکارڈ پیش کیا جائے جسے ان کے سوا کوئی دوسرا پیش ہی نہ کر سکتا تھا۔

حیدر آباد میں حکومتِ ہند کا پولیس ایکشن بڑی تاریخی اہمیت رکھتا ہے لیکن یہ اقدام کیوں اور کس طرح کیا گیا اور اس کے نتائج کیا پیدا ہوئے۔ یہ ایک بڑی دردناک داستان ہے جسے تمام جزئیات کے ساتھ وہی شخص لکھ سکتا تھا جو نظام اور حکومت ہند دونوں کے ارادوں اور اقدامات سے آگاہ ہو اور اُس وقت جبکہ حیدر آباد کے ایک ایک انسان کا دل دھڑک رہا تھا، جناب ہوش بلگرامی ہی تنہا ایسے شخص تھے جن کے ذریعہ سے نظام اور نمایندگانِ حکومتِ ہند کے درمیان انتہائی مادرانہ پیغام و مراسلت ہوا کرتی تھی اور جنھوں نے اپنی جان پر کھیل کر حیدر آباد کو تباہی و بربادی سے بچانے کی انتہائی کوشش کی۔

پھر اگر آپ اس عجیب و غریب داستان کے تمام تفصیلی حالات جاننا چاہتے ہیں تو "مشاہدات" ملاحظہ کیجئے جو علاوہ تاریخی اہمیت کے ادب و انشا کی حیثیت سے بھی خاص امتیاز کی مالک ہے۔

یہ کتاب نہایت نفیس کاغذ پر متعدد تصاویر کے ساتھ مجلد شایع ہوئی ہے اور مع محصول ڈاک بارہ روپئے (عہ ۱۲-) میں

دفتر نگار لکھنؤ سے مل سکتی ہے

نوجوان شاعروں کی ہدایت کیلئے

مولانا حسرت موہانی کا ایک غیر مطبوعہ مقالہ

شاعری کی کوئی جامع و مانع تعریف تو ممکن نہیں لیکن اچھے شعر کی خصوصیات ضرور قلم بند کی جا سکتی ہیں اور انھیں خصوصیات کی بنا پر اچھے اور برے شعر میں تمیز کی جا سکتی ہے ۔ شعرا مختلف طبائع رکھتے ہیں، کوئی نازک خیالی اور مضمون آفرینی کو معراج سخن سمجھتا ہے، کوئی سادگی پر جان دیتا ہے، کوئی تصوف کے مضامین باندھتا ہے ..... شاعر کا موضوع خواہ کچھ ہو لیکن چند فنی بندشوں کا اسے خیال رکھنا پڑتا ہے مثلاً شعر میں عیب تنافر نہ ہو، قبیح طور پر تکرار الفاظ نہ ہو۔ تعقید لفظی نہ ہو کیونکہ یہ بڑا عیب ہے جس کی ناگواری مسلم ہے، اردو الفاظ کے ساتھ فارسی اضافت بھی سراسر معیوب اور ناجائز ہے لیکن اکثر شعراء اس سے بھی پرہیز نہیں کرتے، ضلع جگت بھی اب عیب میں داخل ہے اگرچہ لکھنوی شاعری کے دور میں ضلع جگت کی بڑی قدر تھی اور لفظی رعایات کے بغیر تو کوئی شعر قابل تعریف سمجھا ہی نہ جاتا تھا ..... شتر گربہ، توالئ اضافت، "ابہام و اشکال" غیر شاعرانہ الفاظ کا استعمال، شکست ناروا اور "ایطائے جلی" ..... یہ سب باتیں معائب سخن میں داخل ہیں۔

اس مضمون میں ہمارا مقصد محاسن سخن کو اختصار کے ساتھ پیش کرنا ہے تاکہ ارباب مذاق کو انتخاب سخن و اصلاح سخن کے معاملہ میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

شعر میں خیال کی اہمیت مسلم ہے لیکن اگر خیال شاعرانہ سلیقہ سے ادا نہ کیا جائے تو شعر میں نہ حسن ہوگا اور نہ تاثیر — صرف موزونیت کو شعر نہیں کہتے — ہم آگے چل کر جن محاسن کا ذکر کریں گے وہ شاعری کا زیور ہیں، ہاں یہ بات کہدینا ضروری ہے کہ ایک اچھے شعر میں تمام محاسن بیک وقت مجتمع نہیں ہو سکتے، کسی ایک حسن یا خوبی کا ہونا اس شعر کے اچھے ہونے کے لئے کافی ہے۔

ارباب نظر نے شاعری اور مصوری کو ایک ہی قبیل سے قرار دیا ہے، اس کی بنیاد اور وجہ یہ ہے کہ جس طرح کامیاب مصوری کے لئے لازم ہے کہ جس چیز کی نقل اتاری جائے وہی ہو بہو تصویر میں نظر آئے۔ اس طرح سے حقیقی شاعری کے لئے بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ واقعات محبت، زندگی کے تجربات، ذاتی محسوسات اور خارجی مشاہدات کے بیان میں تصنع سے کام نہ لیا گیا ہو اور جذبات نگاری کی گئی ہو عام اس سے کہ وہ جذبات علوی ہوں یا سفلی، اگر جذبات عالی ہوں گے تو شاعری جذبہ نگاری کی شکل اختیار کرے گی ورنہ معاملہ بندی ہو جائے گی اور ہمارے نزدیک یہی تینوں چیزیں شاعری کا بہترین نمونہ ہیں، معاملہ بندی طایانہ طبائع کی مصنوعی ثقاہت کے لئے ناگوار ثابت ہوتی ہے، لیکن یہ ناگواری انتہائی بدمذاقی اور بے شعوری پر دلالت کرتی ہے، جرأت کی معاملہ بندی میں بڑا کیف ہے۔ مومن کے یہاں بھی معاملہ بندی اعتدال کے ساتھ ملتی ہے اور وہ ابتذال سے گریز کرتے ہوئے معاملات کو پیش کرتے ہیں، جذبہ نگاری، واقعہ نگاری اور معاملہ بندی کی عمدہ مثالیں یہ شعر ہیں:

جی میں تھا ان سے ملئے تو کیا کیا نہ کہئے میر — پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھکر — میر

ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا — کبھی اس سے بات کرنا، کبھی اس سے بات کرنا — مصحفی

جب یہ سنتے ہیں کہ ہمسایہ میں ہیں آپ آئے ہوئے — کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے — جرأت

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ — کیا جانئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا — سودا

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اٹھ بھی کھڑے ہوئے — میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا — آتش
سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری — تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہئے — غالب
دے وہ جس قدر ذلت، ہم ہنسی میں ٹالیں گے — بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا — غالب
غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر — کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے — غالب
ہم بھی اب خوش نہیں وفا کر کے — تم نے اچھا کیا، نباہ نہ کی — مومن
ٹھانی تھی جی میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم — پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم — مومن
وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو — وہی وعدہ تھا جو نباہ کا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو — مومن
انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ — دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ — نظام رامپوری
بیقراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ — اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں — حالی
بے قراروں سے ان کو شرم آئی — شوخیاں رہ گئیں حیا ہو کر — حسن بریلوی
ہر دم اسی کی دھن ہے اسی کا خیال ہے — چھوٹے چھٹائے ربط پر اب تک یہ حال ہے — داغ دہلوی

شاعری صرف معاملہ بندی اور جذبات نگاری تک محدود نہیں، شاعری تو انسان کے بلند ترین جذبات کو کا غذی پیراہن عطا کرتی ہے اسی لئے بعض شاعروں نے متانت مضمون، بلندیِ جذبات اور مذاقِ تصوف کو اختیار کیا۔ متانت مضمون کی مثالیں اردو کے تمام اچھے شاعروں کے کلام میں موجود ہیں، مرزا غالب کی شاعری بلندی جذبات کا دلآویز نمونہ ہے اور میر، درد کی شاعری کی بنیاد سراسر مذاقِ تصوف پر قایم ہے۔ دورِ جدید کے اکثر تعلیم یافتہ شاعر تو بلندیِ مضمون اور ندرتِ خیال کے مقابلہ میں زبان و بیان کی خوبیوں کا کافی لحاظ نہیں رکھتے، جس کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ اچھے سے اچھا مضمون محض ایک ادنیٰ خرابی کی وجہ سے بے لطف ہو کر رہ جاتا ہے۔ اساتذہ کے یہاں متانتِ مضمون اور بلندیِ جذبات کے ساتھ الفاظ و بیان کی خوبیاں ملتی ہیں — میر، خواجہ میر درد، آتش، قایم، ظہیر، حالی، شاد عظیم آبادی، مولوی اسماعیل میرٹھی، بیخود موہانی، آسی سکندرپوری، اقبال، اصغر اور حفیظ جونپوری وغیرہم کے کلام میں متانتِ مضمون بلندیِ جذبات اور صوفیانہ شاعری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں ؎

پھر نہ دیکھا کچھ بجز یک شعلۂ پر پیچ و تاب — شمع تک ہم نے بھی دیکھا تھا کہ پروانہ گیا — میر
ان لبوں نے نہ کی مسیحائی — ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا — درد
ویراں سرائے سینہ سے آتی ہے بوئے خوں — گویا کبھی یہ خانہ ترا جلوہ گاہ تھا — قایم
ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں — حالی
دیر تک میں ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھا کیا — چہرۂ ساقی نمایاں صاف پیمانے میں تھا — شاد عظیم آبادی
پہونچا دیا حدودِ دو عالم سے بھی پرے — مطرب نے راگ چھیڑ دیا کس مقام کا — اسمٰعیل میرٹھی
حد حیرت دیکھتا تھا اپنی آرائش کے ساتھ — آئینہ خانہ میں وہ محوِ خود آرائی نہ تھا — آسی سکندرپوری
دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد — ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے — حسرت
بارِ الم اٹھایا، رنگ نشاط دیکھا — آئے نہیں ہیں یوں ہی انداز بے حسی کے — اصغر

اچھے شعرا کے کلام میں متانتِ مضمون اور بلندیِ جذبات کے ساتھ ساتھ سوز و گداز بھی ملتا ہے — عشق حقیقی ہو یا مجازی آگ کا درجہ رکھتا ہے اور انسان کی روح میں گداز پیدا کرتا ہے، یہی دردمندی عشق اور ہوس کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتی ہے، ہوس ناکی معاملہ بندی کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور میں معاملہ بندی کو بھی اچھی شاعری سمجھتا ہوں کیونکہ جیسا پہلے کہا گیا

معاملہ بندی کو ناگوار سمجھنا بدمذاقی اور بے شعوری کی دلیل ہے بشرطیکہ اس ضمن میں حدِ اعتدال سے نہ گزرا جائے ۔۔۔۔ مگر ظاہر ہے کہ پاک جذبۂ عشق و محبت کا مرتبہ ہوس سے اور سوز و گداز کا درجہ معاملہ بندی سے بلند ہے، یہ پاک محبت ہمیں زیادہ بہتر آدمی بنا دیتی ہے، راقم الحروف نے اسی خیال کو ایک شعر میں یوں ادا کیا ہے :-

ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم سیہ کار تھے باصفا ہو گئے ہم

سوز و گداز کو عاشقانہ شاعری کی جان سمجھنا چاہئے مگر اس کی صحیح مثالیں خاص ہی خاص شعراء کے کلام میں ملتی ہیں، سوز و گداز کو محض رونا دھونا، سینہ کوبی اور آہ و بکا سمجھنا انصاف کا خون کرنا ہے، حق تو یہ ہے کہ اس کا تعلق صفائے قلب اور روح کی نرمی سے ہے اسی سوز و گداز کو شاعرانہ تاثیر کہنا چاہئے اور اس باب میں میر تقی میر کی گرد کو بھی اُردو کا کوئی شاعر نہیں پہونچتا ؎

شعر میرے بھی ہیں پر درد ولیکن حسرت میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

شعرائے لکھنؤ کے یہاں سوز و گداز کم ہے اور آہ و بکا زیادہ، اس سے طبیعت میں گھٹن پیدا ہوتی ہے اور اسی لئے راقم الحروف لکھنوی انداز سخن کا زیادہ دلدادہ نہیں ع حسرت مجھے پسند نہیں طرز لکھنؤ

موجودہ دور کے شعراء میں جناب فانی بدایونی کے کلام میں سوز و گداز موجود ہے اور ان کی شاعری میں سوز و گداز کی صحیح مثالوں کی کمی نہیں، سوز و گداز شعر کو نشتر بنا دیتا ہے اور شعر میں تیر نیم کش کی لذت اور خلش پیدا ہو جاتی ہے ۔۔۔ چند مثالیں انتہائی احتیاط کے ساتھ پیش کرتا ہوں ؎

جب نام ترا لیجئے تب اشک بھر آئے	اس طرح کے جینے کو کہاں سے جگر آئے
فقیرانہ آئے صدا کر چلے	میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ	سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے
رہنے دو پڑا مصحفیؔ خاک بسر کو	اس سوختۂ بے سر و ساماں کو نہ چھیڑو
خوشا قسمت قفس میں ہم، قفس پر سینکڑوں پرزے	نظر بھی اب تو جا سکتی نہیں دیوار گلشن تک
کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجئے،	ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا
ستم کی خو نہ رہی، شیوۂ جفا نہ رہا،	مجھے مٹا کے انھیں کوئی حوصلہ نہ رہا
نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی،	بہت دیر کی مہرباں آتے آتے
ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم	تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفس وہ خواب ہیں ہم
جئے جانے کی تہمت کس سے اٹھتی کس طرح اٹھتی	ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں،
مری اک عمر فانی نزع کے عالم میں گزری ہے	محبت نے مری رگ رگ سے کھینچا ہے لہو برسوں
آہ وہ یاد کہ اس یاد کو ہو کر مجبور،	دلِ مایوس نے مدت سے سنبھالا رکھا ہے
اب یاد رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی	یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

میر
مصحفی
نسیم دہلوی
غالب
مضطر
داغ
شاد عظیم آبادی
فانی بدایونی
حسرت
فراق گورکھپوری

سوز و گداز عاشقانہ شاعری کی جان ہے لیکن انسان پر ہمیشہ ایک ہی کیفیت طاری نہیں رہتی ۔۔۔ غم اور سوز و گداز کے علاوہ جذباتِ مسرت بھی حیات انسانی کا حصہ ہیں اور انسان کی ذہانت کلام میں شوخی و رندی پیدا کر دیتی ہے۔ بعض بافرط غم دانندہ کا مذاق اڑاتے ہیں، روایات کا احترام نہیں کرتے، زاہد و ناصح کی تضحیک کرتے ہیں، واعظ کی پگڑی اچھالتے ہیں، نغمہ و مے کی تحسین کرتے ہیں اور اس طرح ان شاعروں کے کلام میں شوخیِ کلام و رندی مضمون سے بھی اکثر اوقات حسنِ سخن میں بہت کچھ اضافہ ہو جاتا ہے۔ غالب کے یہاں یہ رنگ بہت نمایاں ہے، مولانا حالی نے کیا خوب نکتہ پیدا کیا ہے کہ مرزا حیوان ظریف تھے اور حقیقت تو یہ ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کی طبیعت اور شوخی و رندی میں وہی تعلق تھا جو گوشت اور ناخن میں ہے۔

شوخی و رندی کے سلسلہ میں یہ بات بھی واضح ہو کہ ہجو زاہد و واعظ کا ہر مضمون پسندیدہ ہی نہیں ہوتا بلکہ بعض موقعوں پر تو بے باکی و بے پرگی کی شدت مذاقِ سلیم کو ناگوار گزرنے لگتی ہے مثلاً :-

پندِ واعظ سنتے سنتے کان اپنے بھر گئے　　کیا عبادت کو ہمیں ہیں سب فرشتے مر گئے　　داغ

لاریب حسنِ کلام کی ترقی کے لئے اس قسم کے مضامین میں بھی پیرایۂ بیان کی لطافت اور مفہوم "کنایہ" کو ندرت کا جامہ لازمی ہے کرتا ہے ۔ شوخیِ کلام کے سلسلہ میں خمریات کی بڑی اہمیت ہے، حضرت ریاض خیرآبادی اور مرزا محمد نقی بیگ صاحب مایل دہلوی کو خمریات کا "اسپیشلسٹ" سمجھنا چاہئے، ان کا کلام پڑھنے ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں حضرات اس میدان میں کیسے کیسے شوخ و لطیف شعر نکالتے ہیں ۔

بڑے پاک طینت بڑے صاف باطن　　ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں
فرشتے عرصہ گاہِ حشر میں ہم کو سنبھالے ہیں　　ہمیں تو آج لطفِ لغزشِ مستانہ آتا ہے　　ریاض خیرآبادی
بے سبب بارانِ رحمت قبرِ واعظ پر نہیں　　کوئی پتھر لگ گیا مے خانہ کی بنیاد کا
واعظ نہ بڑھا شوکتِ دروازۂ مسجد　　مئے خوار چلے آئیں گے مے خانہ سمجھ کر　　مایل دہلوی

شوخیِ کلام کے جو نمونے رندانہ اشعار کے علاوہ عاشقانہ اشعار میں پائے جاتے ہیں وہ اپنی خوبی میں خمریات کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں ۔ مثلاً آتش ؎　　روٹھ کر ملنے جو جاتا ہوں تو کہتا ہے وہ شوخ　　کل خفا تم سے تھے مزاج آج ہے ناساز اپنا

ناسازیِ مزاج کے مصنوعی بیان میں طعن کا بھی پہلو نکلتا ہے اس کی شوخی ملاحظہ طلب ہے :

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا　　ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو　　غالب

سر اڑانے کا حتمی وعدہ کرنے کے لئے اسی سر کی قسم کھانا مضمون کی ایک عجیب و غریب شوخی ہے جس کی کافی داد نہیں دی جا سکتی :

نہ میں سمجھا نہ آپ آئے کہیں سے　　پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے　　انور دہلوی

انور کا یہ مطلع شوخیِ محاورہ کی بہترین مثالوں میں سے ہے اور دوسرے مصرعہ کے شوخ کنائے نے مصرعہ اول کی نفی کو اثبات سے بھی پرلطف بنا دیا ہے ۔

کہئے تو کہوں انجمنِ غیر کی روداد ،　　کیا اب بھی اسے آپ کرامت نہ کہیں گے　　ظہیر دہلوی

شوخیِ کلام ملاحظہ ہو کہ کرامت کا دعویٰ بھی کیا تو کن معاملات کے علم کی بابت، جن کا متعلق بہ رندی و ہوس ناکی ہونا بہرحال مسلم ہے

نہ آنا اے اجل تجھ کو قسم ہے وقتِ آخر تک　　ابھی کچھ عمر باقی ہے اسے بھی رائگاں کر لیں　　نظم طباطبائی

شاعر نے عمر ضائع ہونے کو عجب طور سے اپنا ایک محبوب مشغلہ بے باکی و ہوسناکی ہونا ظاہر کیا ہے، اس شوخیِ بیان کی داد نہیں دی جا سکتی ۔

شوخیِ کلام کی وجہ سے پرانے مضامین بھی نئے معلوم ہوتے ہیں، شعراء کے مضامین عاشقانہ طور پر ایک سے ہوتے ہیں یعنی ہجر و وصال بے قراری و بے چینی، اپنی وفا محبوب کی جفا، رقیب روسیاہ کی بوالہوسی، کوچۂ یار کی رونق، خوبیِ جسم نازنین ـــ فلسفہ و تصوف کے مضامین بھی مشترک ہوتے ہیں، لاریب یہ طرزِ بیان ہی ہوتا ہے جو ایک شاعر کے کلام کو دوسرے سے الگ کرتا ہے، پستی اور بلندی بھی طرزِ سخن سے پیدا ہوتی ہے اسی لئے شاعری میں شوخیِ کلام اور تازگیِ بیان کی ضرورت ہے، ندرتِ مضمون تازگیِ بیان کا ثمرہ ہے حسنِ کلام کے ارکان میں تازگیِ بیان اور ندرتِ مضمون کا بھی درجہ بہت بلند واقع ہوا ہے، بسا اوقات ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ مضمون نہایت معمولی اور بالکل پامال و فرسودہ تھا مگر بیان کی ذرا سی تازگی نے اس میں ندرت پیدا کر دی اور اسے نہایت پسندیدہ اور نہایت برگزیدہ بنا دیا ـــ مندرجۂ ذیل اشعار میں تازگیِ بیان و ندرتِ مضمون ملاحظہ ہو ؎

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ — نادان پھر وہ دل سے بھلایا نہ جائے گا
"مرا دانہ زیست کرتا تھا، — میر کی وضع یاد ہے ہم کو — میر
دیکھئے دا ماندگی اب کیا دکھائے — قافلہ یاروں کا سفر کر گیا — سودا
شیشے کی طرح شام سے رو رو کے تا سحر — خالی کریں دل کو تری انجمن میں ہم — میر سوز
کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں — سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں
اس نقشِ پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل — میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا — مومن
نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا — مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ — ہے یوں کہ مجھے درد تہہ جام بہت ہے — غالب
آنکھوں کے تقاطر سے خبردار ہو دامن — کچھ اور ارادہ ہے مرے ابرِ کرم کا — نسیم دہلوی
ہم جس پر مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور — عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں — حالی
اس نو بہارِ حسن کو بدنام مت کرو — تھی شیفتہ کے پہلے سے شورش دماغ میں — شیفتہ
تشبیہ مرے حالِ پریشاں سے نہ دینا — ایسا نہ ہو وہ گیسوئے شب رنگ بکھر جائے — مجروح
تھا جفاکش ایک سالک آج وہ بھی مر گیا — اب لئے بیٹھے رہو تم شکوۂ بیداد کو — سالک دہلوی
نو بہار آئے اور کیا ہوگا — کچھ نکھر جائے گا خزاں کا رنگ — ناظم رامپوری
جب اہلِ ہوش کہتے ہیں افسانہ آپ کا — ہنستا ہے دیکھ دیکھ کے دیوانہ آپ کا — شاد عظیم آبادی
عالمِ ہو میں اک آواز سی آجاتی ہے — چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا — ریاض خیرآبادی
ہم نے جب وادیِ غربت میں قدم رکھا تھا — دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو — وحید کرادی
بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے — ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے — حفیظ جونپوری
کہہ کے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے — مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا — اصغر
اے زہدِ خشک تیری ہدایت کے واسطے — سوغاتِ عشق لائے ہیں کوئے بتاں سے ہم — حسرت
نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں — اک ایسی راہ پر جو تیری رہ گزر بھی نہیں — فیض

اب تک ہم نے شاعری کے معنوی محاسن سے بحث کی ہے، آنے والے صفحات میں ہم اختصار کے ساتھ مثالوں کی مدد سے شعر کی فنی اور لفظی خوبیوں کو اپنے پڑھنے والوں کے لئے قلم بند کریں گے، لیکن یہاں ایک بات کی وضاحت لازم ہے، ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ اساتذہ کے یہاں مضمون اور بیان کے محاسن ساتھ ساتھ ملتے ہیں، ایک اچھے مضمون کو اگر بہ سلیقگی کے ساتھ نظم کیا جائے تو اسکی خوبیاں ختم ہو جائیں گی، راقم الحروف کا خیال ہے کہ الفاظ و معانی میں وہی ربط ہے جو جسم و روح میں — ذاتی تجربہ بھی یہی ہے کہ جو خیال میرے ذہن میں شدت کے ساتھ آتا ہے وہ خود بخود اپنے لئے الفاظ مناسب انتخاب کرتا ہے اور اس ضمن میں میرے التزام کی نوبت نہیں آتی۔ الفاظ اپنے مفہوم و معنی کی طرف دلالت کرتے ہیں، مرزا غالب نے کیا خوب فرمایا ہے کہ:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے — جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

دورِ حاضر کے بعض شعراء کا رجحان زیادہ تر اس جانب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے کلام کی خوبی کا دارومدار استعمال ترکیب فارسی اور دشوار گوئی پر رکھیں، جس کو پیروی غالب کے مرعوب کن نام سے موسوم کرتے ہیں حالانکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ غالب کے بھی بہترین اشعار وہی ہیں جن کی برتری صدقِ محاورہ یا صفائی زبان کی مرہونِ منت ہے، میرا خیال ہے کہ لطفِ سخن کے طالبانِ صادق کو اسی سادگی

سے تسکین ہوسکتی ہے۔ سادگی بیان شعر کو نیچرل بناتی ہے اور گفتگو سے قریب تر لاتی ہے، مرزا غالب کے یہاں طبع زاد یا فارسی کے زیر اثر تخلیق کی ہوئی ترکیبوں کی کمی نہیں، لیکن اپنی آخری عمر میں انھوں نے سادگی کو اپنا شعار بنالیا اور صفائی زبان کو اختیار کیا اور یہ امر ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں اُن کے خیالات میں زیادہ پختگی آگئی تھی ـــــ خیال کو سادگی، صدقِ محاورہ اور صفائی زبان کے ساتھ پیش کردینا انتہائی کمال ہے جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے ثابت ہوجائے گا ؎

تم کہ بیٹھے ہوئے اک آفت ہو	اُٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو	شاہ حاتم
دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا	آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا	قایم چاندپوری
نہ خفا ہو کہ آن نکلے ہیں،	ہم بھی یاں اتفاق کے مارے	میر حسن
غنچے تری غنچہ دہنی کو نہیں پاتے	ہنستے ہیں مگر تیری ہنسی کو نہیں پاتے	ذوق
اُن سے ہم لو لگائے بیٹھے ہیں	آگ دل میں دبائے بیٹھے ہیں	انور دہلوی
خالی شرارتوں سے یہ طرزِ حیا نہیں	کیا جانے کوئی دل میں ترے کیا ہے کیا نہیں	داغ
یاد کرتے ہیں مگر یاد نہیں آتا ہے	بھول آئے ہیں کہاں ہم دلِ مضطر اپنا	ہجر شاہجہانپوری
مرگِ عاشق تو کوئی بات نہیں	پر کہے گا تمھیں زمانہ کیا،	مست بنارسی
مرگِ عاشق تو کچھ نہیں لیکن	اک مسیحا نفس کی بات گئی	جگر مرادآبادی

سادگی زبان اور صفائی بیان کے سلسلہ میں دانستہ میر، غالب اور مومن کے شعر نہیں پیش کئے گئے کیونکہ ان کے اشعار میں سادگی معجزہ بن گئی ہے اور اس معجزہ کو سہلِ ممتنع کہتے ہیں، سہلِ ممتنع سادگی وحسنِ بیان کی اس صنف کا نام ہے جس کو دیکھ کر ہر شخص بظاہر یہ سمجھے کہ یہ بات میرے دل میں تھی اور ایسا کہنا ہر شاعر کے لئے آسان ہے مگر جب کوشش کرکے ویسا لکھنا چاہے تو نہ لکھ سکے ـــ معمولی خیال کو سادگی سے نظم کردینا کوئی کمال نہیں اور نہ اسے ہم سہل ممتنع کہیں گے بلکہ کسی گہرے، ادق اور بڑے خیال کو یوں نظم کردینا کمال ہے، ایسے ہی اشعار کو ضرب المثل کا درجہ حاصل ہوجاتا ہے اور اشعار زبان کا حصہ بن جاتے ہیں اور یہ بات کسی بھی شاعر کی حیاتِ جاوداں کی ضمانت ہے۔

میر ان نیم باز آنکھوں میں	ساری مستی شراب کی سی ہے	
جب کہ پہلو سے یار اُٹھتا ہے	درد بے اختیار اُٹھتا ہے	
آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم	ہوگئے خاک انتہا ہے یہ	میر
شاہد رہیو تو اے شبِ ہجر	جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی	مصحفی
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو	اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا	
قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے	کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی	
دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے	آخر اس درد کی دوا کیا ہے	
ہوچکیں غالب بلائیں سب تمام	ایک مرگِ ناگہانی اور ہے	غالب
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے	ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا	
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا	جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا	مومن
رنج اور رنج بھی تنہائی کا	وقت پہونچا مری رسوائی کا	حالی
تندرستی اگر نہ ہو سالک	تندرستی ہزار نعمت ہے	سالک دہلوی

ہے آج سرگزشت اپنی — کل اُس کی کہانیاں بنیں گی — امیر مینائی
زندگی کیا ہے آج سے اے دوست — سوچ لیں اور اُداس ہوجائیں — فراق گورکھپوری
گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں — انھیں کی یاد میری زندگی ہے — عندلیب شادانی
زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا — ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے — ثاقب لکھنوی

اسی سادگیِ بیان و زبان سے اشعار میں تاثیر پیدا ہوتی ہے، راقم الحروف کے کلام میں ترکیبِ مومن کی نیرنگیاں بھی ہیں اور وہ اپنی اس خوش بیانی پر نازاں بھی ہے لیکن سادگی کو زیادہ پسند کرتا ہے ؎

سہل کہتا ہوں ممتنع حسرت — نغز گوئی مرا شعار نہیں

کیونکہ تاثیر علمیت کے اظہار سے زیادہ اہم ہے اور شعر کی صحیح تعریف یہ ہے ؎

شعر در اصل ہیں وہی حسرت — سنتے ہی دل میں جو اُتر جائیں

سادگی اور صفائی میں بہت سی خوبیاں مضمر ہیں، لیکن طبیعت انسانی تنوع اور نیرنگی و رنگا رنگی کو بھی پسند کرتی ہے اسی لئے خوبیِ ترکیب، خوبیِ استعارہ و لطفِ تشبیہ کو بھی پیشگاہِ سخن میں بہت بڑا درجہ حاصل ہے، میں ان تینوں کا ذکر ایک ہی جگہ اس لئے کر رہا ہوں کہ اکثر یہ خوبیاں بے حد متصل اور ایک دوسرے سے دست و گریباں پائی جاتی ہیں — حسنِ ترکیب میں غالب و مومن کا کوئی شاعر ہمسر نہیں ہوسکتا، ان دونوں شاعروں نے بہت سی ترکیبیں اختراع کیں یا فارسی ترکیبوں کو اُردو میں اس طرح استعمال کیا کہ مقبول ہوئیں اور دوسرے شاعروں نے انھیں اختیار کیا، غالب کی ترکیبوں میں جہاں کہیں غرابت نہیں بڑی معنویت ہے، حق تو یہ ہے کہ مرزا ان ترکیبوں کے بغیر معنی آفرینی کا حق ادا نہ کرسکتے تھے، وہ مضامین جو غیب سے ان کے خیال میں آتے تھے مروجہ زبان میں بیان نہ ہوسکتے تھے فارسی زبان مرزا غالب کے دل و دماغ کا حصہ تھی۔ بایں وجہ وہ فارسی طرز کی ترکیبیں اختراع کرتے تھے، مومن کی ترکیبوں میں بھی فارسیت ہے مگر وہ عاشقانہ اندازِ سخن رکھتے تھے اسی لئے ان کے یہاں نرمی زیادہ ہے اور غالب کے یہاں شان و شکوہ اور طمطراق — یہ بندۂ ناچیز حسرت موہانی مومن کے سلسلۂ تلمذ کا ایک شاعر ہے اسی لئے سادگی پسند ہونے کے باوجود ترکیبوں کے باب میں تقلید مومن کرتا ہے ؎

کہاں سے آئیں گی نیرنگیاں ترکیبِ مومن کی
یہ لطفِ خوش بیانی حسرتِ رنگیں نوا تک ہے

میرے کلام میں جو لطیف، شگفتہ اور حسین تراکیب جا بجا موجود ہیں اور یہ فیضانِ مومن و نسیم ہے لیکن اس میں میرے مطالعۂ فارسی کو بھی دخل ہے، "جفا ہائے التزامی"۔ "سرمایہ دار انتظار"۔ "تغافل ہائے پیدا"۔ "روشِ حسن مراعات"۔ اور زندانِ تمنا کی ترکیبیں مجھے بے حد مرغوب ہیں:

؎ کمالِ خاک ساری پر بے پروائیاں حسرت،
میں اپنی داد خود دے لوں کہ میں بھی کیا قیامت ہوں

یہی حسین ترکیبیں اکثر اوقات خوبیِ استعارہ اور لطفِ تشبیہ اپنے اندر چھپائے رکھتی ہیں یا نتیجتاً خوبیاں پیدا ہوجاتی ہیں — اساتذہ اور ممتاز شعراء کے کلام سے حسنِ ترکیب، خوبیِ استعارہ و لطفِ تشبیہ کی مثالیں درج کی جاتی ہیں ؎

آویزہ گہر ہے بنا گوشِ یار میں — یا سرنگوں ہے اس کے مقابل غرورِ صبح — سودا
دے ہنس میں جو اشکبار ہوا — گریہ کیا آبروے کار ہوا — راسخ عظیم آبادی
ملگجے کپڑوں میں یوں ہے جلوہ گر اُس کا بدن — دھوپ جیسے شام کی ہو یا سحر کی چاندنی — میر حسن
ہوتی ہی نہیں کم کسی عنواں تپشِ دل — ہے دامنِ مژگاں سے فروزاں تپشِ دل — مذہب شاگرد سودا

رنج و راحت کا مرے واسطے ساماں ہوگا — مشتعل راہِ عدم داغِ عزیزاں ہوگا — آتش

ناکامیوں کی کاہشِ بے جا کا کیا علاج — بوسہ دیا تو ذوقِ لبِ یار کم ہوا

بے کاریِ امید سے فرصت ہے رات دن — وہ کار و بارِ حسرت و ارماں نہیں رہا — مومن

جما ہے قطرۂ خونِ جگر شمشیرِ دشمن پر — تماشا ہے یہ گل پھولا نیا دیوارِ آہن پر — نسیم دہلوی

کیا کہوں جھپٹ کے میں اس گل تر سے تسلیم — صورتِ نکہتِ برباد کہیں کا نہ رہا، — تسلیم لکھنوی

کب داغ یہ دل پر شبِ ہجراں میں لگے ہیں — نایاب کنول انجمنِ جاں میں لگے ہیں — رضوان مرادآبادی

اب وصال اس سمن انداز کو کہاں — بس بس نہ چھیڑ اے خلشِ آرزو مجھے — شیفتہ

ناچند نظر بازی و پابندیِ تقویٰ — ہمسائیگیِ شعلہ و سیماب کہاں تک — ظہیر دہلوی

خرامِ جلوہ کے نقشِ قدم تھے لالہ و گل — کچھ اور اس کے سوا موسمِ بہار نہ تھا — آسی سکندرپوری

گلستاں کر دیا ہے دامنِ دل کو تصور نے — ہوائے شوق میں حاصل ہے عیشِ جاوداں مجھ کو — رضا علی وحشت

جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے — سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے — چکبست

کلام میں حسن پیدا کرنے کے اور بھی طریقے ہیں، ہمارے شاعر زبان و بیان پر بڑی قدرت رکھتے ہیں اور انھیں زبان کا مزاج داں کہنا چاہئے ـــــ اگر زبان پر قدرت ہو اور شاعر کو اندازِ بیان پر کمال حاصل ہو تو اشعار میں محض مصرعوں کے تقابل یا الفاظ کے الٹ پھیر سے بھی ایک قسم کا حسن پیدا ہو جاتا ہے، کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک مصرع میں کسی قدر تغیر و تبدل کر کے اور غزل کی ردیف کا خیال کر کے دوسرا مصرع کہہ لیا جائے ـ مرزا داغ اور ان کے متبعین کے کلام میں ایسی امثال کی کمی نہیں، اس باب میں مضطر خیرآبادی کی غزلیں بھی ملاحظہ طلب ہیں، عہدِ جدید کے شعراء بھی اس اسلوب کو مرغوب رکھتے ہیں اور یہ حسن انھیں پسند ہے، جوش ملیح آبادی کی نظموں میں حسنِ تکرار کے عمدہ نمونے ملتے ہیں، مجاز ردولوی اور جذبی بھی اس صنعت سے کام لیتے ہیں، اس لحاظ سے مجھے جذبی کا یہ شعر بہت پسند ہے ؎

میری ہی نظر کی مستی سے سب شیشہ و ساغر رقصاں تھے
میری ہی نظر کی گرمی سے سب شیشہ و ساغر ٹوٹ گئے

چند اور مثالیں پیش کی جاتی ہیں ؎

میں پھر کہوں کہ پاس مرے کوئی آئے کیوں — تم پھر کہو کہ کوئی کسی کا کرے گا کیا، — مضطر خیرآبادی

مدہوشیِ ارباب نظر کو کوئی سمجھے — خاموشیِ ارباب نظر کو کوئی دیکھے — بیخود بدایونی

دیکھنا یہ ہے کہ ہم نے تمہیں کیسا چاہا — یہ پوچھنا یہ ہے کہ تم نے ہمیں کیسا دیکھا — حسن بریلوی

اس مضمون کے آخر میں مطابقتِ الفاظ و مضمون کے ضمن میں کچھ کہنا مناسب ہوگا۔ مضمونِ شعر اور الفاظ شعر میں مطابقت کا قایم کرنا منجملہ کمالاتِ شاعری بہت کچھ اہم سمجھا جاتا ہے اور عموماً بہت بڑی قوت اور مشقِ سخن کا نتیجہ ہوا کرتا ہے ـــــ میر صاحب کی شاعری میں رنج و غم کا بیان ہے اور وہ ویسے ہی الفاظ لاتے ہیں لیکن جب وہ اپنے معشوق کے حسن کا تذکرہ کرتے ہیں تو وہ خوبصورت الفاظ منتخب کرتے ہیں جن میں بے حد شگفتگی ہوتی ہے ـ ؎

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے — تیری آنکھوں کی نیم خوابی سے

انگریزی داں اصحاب تکرارِ الفاظ یا تکرارِ حروف کو بے حد پسند کرتے ہیں کیونکہ انگریزی شاعری کی یہ ایک مقبول صنعت ہے، ہماری شاعری میں الفاظ و حروف کی یہ ایک مقبول صنعت ہے، ہماری شاعری میں الفاظ و حروف کی تکرار عام اس سے کہ وہ شعر کے ایک ہی

مصرع میں ہو یا دونوں میں عموماً قبیح سمجھی جاتی ہے، راقم الحروف کا بھی عرصہ تک یہی خیال تھا اور یہی معیارِ سخن میں لکھا بھی ہے لیکن اب میری رائے یہ ہے کہ اس ضمن میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں دیا جا سکتا بلکہ اس کا فیصلہ ذوقِ سلیم ہی کر سکتا ہے، تکرارِ الفاظ و حروف کی اکثر صورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں، جن کی موجودگی حسنِ شعر کی ترقی کا موجب ہوا کرتی ہے، مثال کے طور پر میر تقی میر کا مندرجۂ بالا شعر جس میں کم کم کی تکرار اور حرفِ "ک" کی تکرار سے عجیب لطف پیدا ہو گیا ہے۔ اساتذہ کے یہاں ایسی مثالوں کی کمی نہیں ؎

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے — تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی — غالب

کس تجاہل سے یہ کہتا ہے کہاں رہتے ہو — تیرے کوچے میں ستمگار! ترے کوچے میں — شیفتہ

زندگی میں ترکِ شغلِ عشق کیونکر کیجئے — زندگی بھی، زندگی کا مدعا بھی عشق ہے — آزاد سہارنپوری

غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی — جو روشنی کہ شام سوادِ وطن میں تھی

آہ وہ یاد کہ اس یاد کو ہو کر مجبور — دلِ مایوس نے مدت سے بھلا رکھا ہے — حسرت موہانی

اس طرح یہ بات طالبانِ ذوقِ سخن کو معلوم ہو جائے گی کہ تکرارِ الفاظ و حروف سے بھی مضمون و الفاظ میں مطابقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی اور بھی بہت سی صورتیں ہیں —— اچھا شاعر ہمیشہ مناسب الفاظ لاتا ہے تاکہ وہ خیال اور بہتر ہو جائے ؎

کبھی خوش بھی کیا ہے دل کسی رندِ شرابی کا — بھڑا دے منہ سے منہ ساقی ہمارا اور گلابی کا — درد

پہلے مصرعہ میں مضمونِ رندی و بے باکی کی مناسبت سے مصرعِ ثانی میں "لگا دے" کی جگہ "بھڑا دے" لکھا ہے اور خوب لکھا ہے ؎

سوادِ گیسوئے مشکیں میں ظلمت شام کی پائی — بیاضِ گردنِ محبوب میں نورِ سحر دیکھا — آتش

سیاہی شام کے اعتبار سے سوادِ گیسو اور سپیدۂ سحر کے لحاظ سے بیاضِ گردن ہی لکھنا مناسب تھا، چنانچہ آتش نے وہی لکھا اور خوب لکھا۔

ہم نے یہ مضمون ان نوجوانوں اور شاعروں کے لئے لکھا ہے جو شاعری کا قابلِ قدر رجحان رکھتے ہیں تاکہ ان کے سامنے شاعری کا ایک معنوی اور فنی معیار رہے اور وہ مبتذل یا خراب اشعار سے دامن کشی کریں، یہ ضرور ہے کہ شاعری کی تمام خوبیوں کا احاطہ کوئی بھی نہیں کر سکتا اور اسی لئے اپنے ذوق کی تربیت کرنا لازم و ضروری ہے، کیونکہ ذوقِ سلیم حقیقی کسوٹی ہے جو کسی کم عیار چیز کو پسند نہیں کرتی —— اس مضمون میں مثالیہ اشعار اسی لئے کثرت سے درج کئے گئے ہیں تاکہ رہنمائی و رہبری ہو سکے اور یقین ہے کہ پڑھنے والے ان اشعار کو دلچسپی اور دل پذیری سے خالی نہ پائیں گے۔

(سیارہ)

"نگار" کے پچھلے تین سالنامے

سالنامہ ۳۱ء جس میں علم "فراست التحریر" کے اصول پیش کئے گئے تھے اور جن کو دیکھ کر آپ ایک شخص کا سوادِ خط دیکھ کر اسکے کیرکٹر کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ صرف ایک کاپی باقی ہے —— قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۳۷ء اس میں ڈرامہ "اصحاب کہف" اڈیٹر کے قلم سے پورا شایع ہوا ہے اور "خلافت و امامت" کے مسئلہ پر گفتگو کا آغاز ہوا ہے —— قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۳۸ء اس میں تاریخ اسلامی ہند کے عہد خلافت و امامت پر مختتم بحث کی گئی ہے جس کی ابتدا ۳۷ء میں ہوئی تھی —— قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

فنِ تحریر کی تاریخ

(بہ سلسلۂ ماسبق)

مختصر نویسی - ناروے اور سویڈن میں رونی خط نے مختصر نویسی کی صورت اختیار کرلی تھی - اس خط کے کتبے گیارھویں صدی عیسوی کے ہیں اور (Haelsingeland) کے علاقہ میں پتھروں پر کندہ کئے ہوئے ملے ہیں اسی لئے اس خط کو (Haelsinge Runes) کہا جاتا ہے - نیچے اس کی دو قسموں کے حروف نقل کئے جاتے ہیں :-

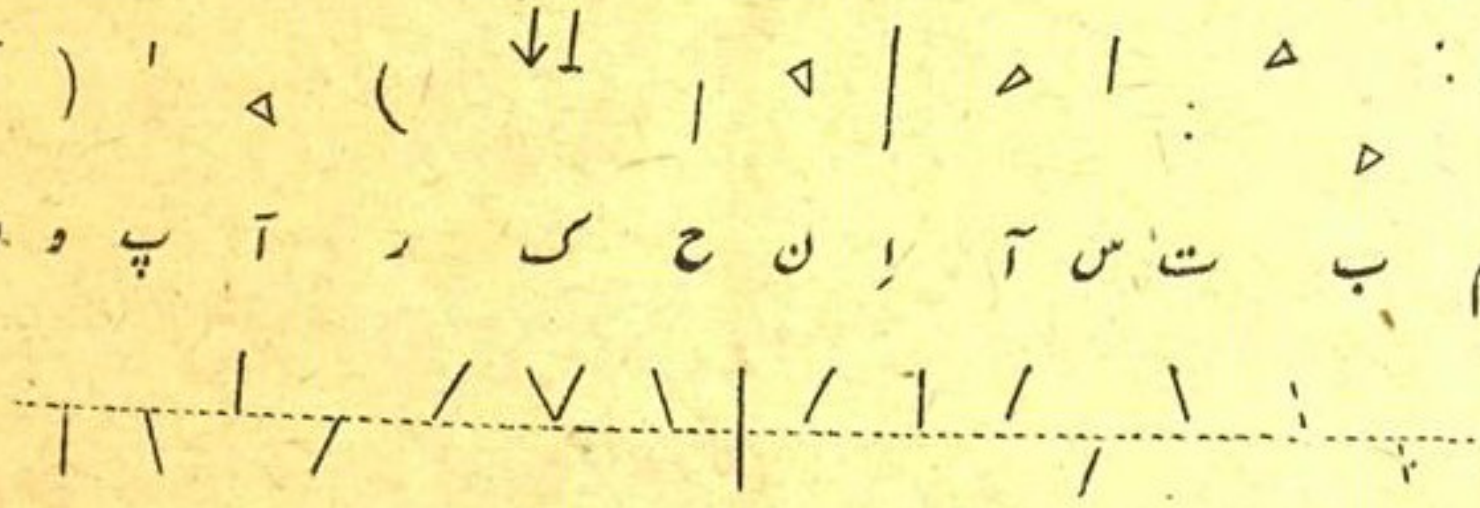

ر ل م ب ت س آ اِ ن ح ک ر آ پ و ف

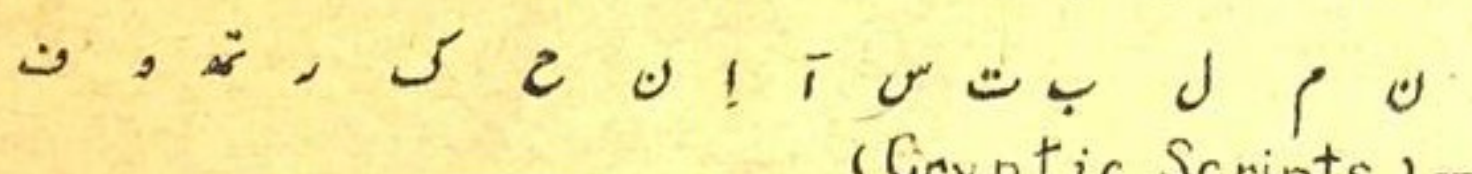

ن م ل ب ت س آ اِ ن ح ک ر تھ و ف

مرموز نویسی — (Cryptic Scripts)

رونی خط ہی کو سامنے رکھ کر بعض رمزی خط ایجاد کئے گئے - سینٹ گیلن (St. Gallen) کے مسودے میں ایسے متعدد خطوں کا ذکر ہے - نیچے اس کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں، ان میں لفظ (Corui) کو چار رمزی خطوں میں لکھا ہے :-

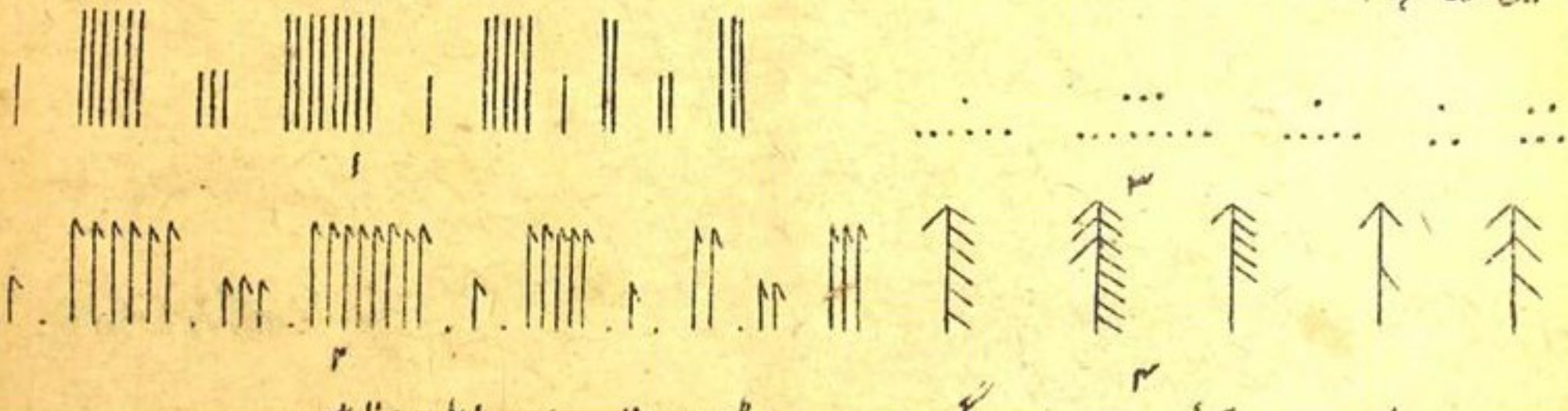

ان کے نام (۱) آئس رونا - (۲) لوگو رونا - (۳) سٹوف رونا - (۴) ہاہل رونا ہیں -
اسی سلسلہ میں دو اور خطوں کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے جو بالترتیب "مشجّر رونی"[1] (Twig Runes) اور

---

[1] اس کا مقابلہ عربی کے خط "مشجر" سے کیجئے - ملاحظہ ہو نگار بابت ستمبر ۵۴ء

"صلیبی رونی" (Cross. Runes) کہلاتے تھے۔ ان کے نمونے یہ ہیں :-

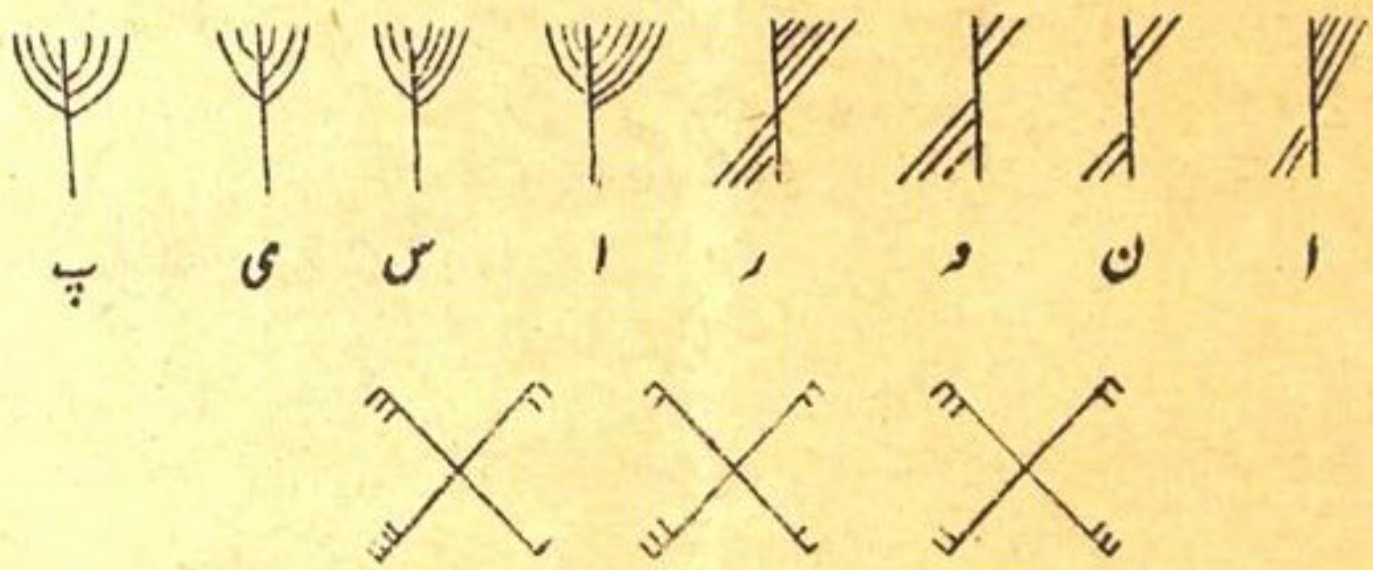

کتبے۔ قدیم جرمن قومیں لکڑی کے کام میں بہت ماہر تھیں اور شروع میں رونی خط لکڑی ہی پر کندہ کیا جاتا تھا۔ لیکن لکڑی پر منقوش کتبے تھوڑے ہی سے دستیاب ہوئے ہیں، اکثر تلف ہوگئے، جو کتبے باقی رہ گئے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جرمن قبایل میں چوبی جنتریاں رائج تھیں جو چند انچوں سے لیکر پانچ فیٹ تک لمبی ہوتیں، جن میں تصاویر کے ذریعہ سے تہوار اور رونی حروف میں تاریخیں ظاہر کی جاتی تھیں۔

دھات کی تختیوں پر بھی رونی کتبے پائے گئے ہیں۔ ذاتی استعمال کی چیزوں مثلاً آلات حرب و ضرب اور زیورات پر اُن کے بنانے والوں یا مالکوں کے نام کندہ ہیں۔ بعض کتبے سونے کے گول تمغوں پر پائے گئے ہیں جو اہل روما کی تقلید میں بنائے گئے تھے۔ پانچویں صدی سے ان نقوش کے درمیان آرائش یا علامات کے طور پر بعض جانوروں کی تصاویر بھی بنائی جانے لگیں۔

ان چوبی و فلزاتی کتبوں کے علاوہ جو پورے یورپ میں رومانیہ اور مغربی روس سے لیکر فرانس تک ملے ہیں، ہزاروں کتبے پتھروں پر کندہ ڈنمارک، ناروے اور سویڈن میں موجود ہیں۔

مذکورۂ بالا کتبوں کا زمانہ پہلی سے پندرھویں صدی عیسوی تک ہے۔ ان کے علاوہ نویں سے گیارھویں صدی عیسوی تک کے بعض مسودے بھی لیڈین ——— ویانا اور آکسفورڈ کے کتب خانوں اور عجائب گھروں میں محفوظ ہیں مسودوں کی کمی اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ خط علمی و ادبی کاموں میں شاذ ہی استعمال کیا جاتا تھا۔ نیچے مختلف ممالک کے کتبوں کا علٰحدہ علٰحدہ ذکر کیا جاتا ہے۔

ڈنمارک —— رونی خط کے قدیم ترین کتبے (۵۰ سے اوپر جن میں ۴۰ تمغے شامل ہیں) ڈنمارک کے جنوبی مغربی حصے میں ملے ہیں۔ یہ تیسری سے چھٹی صدی عیسوی تک کے ہیں اور ۲۰۰ کتبے جو پتھروں پر کندہ ہیں نویں اور گیارھویں صدی عیسوی کے بیچ کے ہیں۔

بیچ چوتھی یا پانچویں صدی عیسوی کے ایک رونی کتبے کی نقل پیش کی جاتی ہے جو ایک طلائی قرنا پر کندہ ڈنمارک میں ۱۰۳۴ء میں ملا۔ ۱۸۰۲ء میں یہ قرنا چوری ہوگیا اور سونے کے لالچ میں اُسے گلا ڈالا گیا۔

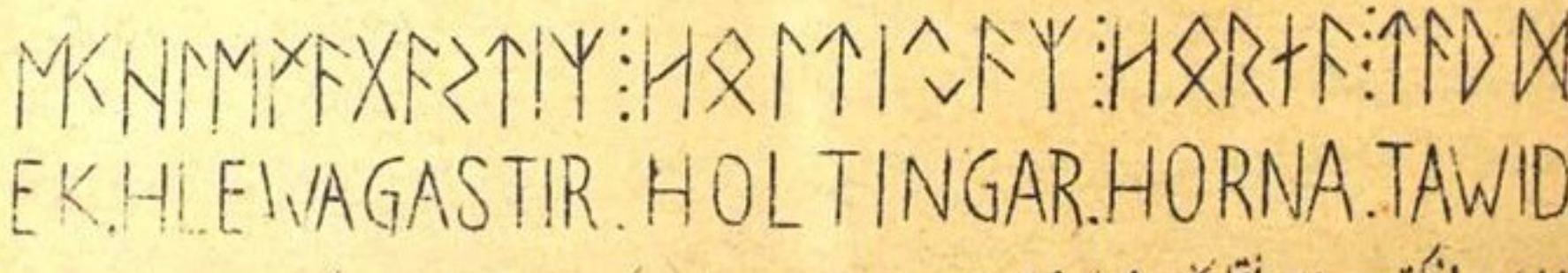

(۱) رونی کتبہ۔ (۲) نقل بخط رومن۔ ترجمہ "میں ہلیوالسٹ ہولٹ (کے باشندے) نے اس قرنا کو بنایا"

برطانیہ :- تقریباً ۵۰ رونی کتبے ملے ہیں۔ ان میں سے بیشتر انگلستان میں نہیں بلکہ جزیرۂ آرکنی (Orkney

کمبرلینڈ (Cumberland) اور آئل آف مین[1] (Isle. of. Man) میں پتھروں پر کندہ پائے گئے ہیں۔ ان مقامات پر ناروے کے لوگ آباد تھے۔ علاوہ ازیں کینٹ (Kent) میں جسے جوٹ (Jute) لوگوں نے فتح کر لیا تھا۔ ڈمفریس شائر (Dumfriesshire) میں رتھ ویل (Ruthwell) کی صلیب پر ایک مشہور رونی کتبہ ہے۔ کمبرلینڈ میں بیوکیسل (Bew Castle) پر ساتویں صدی عیسوی کا ایک قابلِ ذکر کتبہ پایا جاتا ہے۔ نیچے کا اینگلو سیکسن کتبہ ایک سونے کی چوڑی پر منقوش ہے جو کنگ مور (کمبرلینڈ) میں ملی تھی:

ᚦᚠᚱᚻᚱᛁᛖᚠᛏᚻᚱᛁᛖᚱᛁᛒᚠᛏᚷᛚᚠᚠ ᛏᚠᚳᚠᛏ

ᛏᚠᚠ

انگلستان کے مشہور کتبوں میں ایک تلوار نما چاقو ہے جس پر رونی حروف منقوش ہیں۔ یہ ۱۸۵۷ء میں دریائے ٹیمس میں ملا تھا اور اب برٹش میوزیم (لندن) میں محفوظ ہے۔ اگرچہ بعض عالم اسے پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی کا بتاتے ہیں لیکن غالباً یہ ۸۰۰ء کا ہے۔ دوسرا مشہور کتبہ وہیل کی ہڈی کے بنے ہوئے ایک صندوقچہ پر پایا جاتا ہے جو "فرینکس کیسکیٹ" کہلاتا ہے اسے (Sir Wollaston Franks) نے ۱۸۵۷ء میں خرید کر برٹش میوزیم کو تحفے میں دیا تھا جہاں اب بھی یہ محفوظ ہے (اسعاد ائیں حصے کے جو فلورنٹس کے بارگیلو میوزیم میں ہے) اسے بعض عالم ۶۵۰ء اور بعض ۷۰۰ء کا بتاتے ہیں۔ اس کے ایک رخ پہ مشہور جڑواں بھائیوں رومولس اور ریموالس کی تصویر ہے جن کے بارے میں روایت ہے کہ انھیں ایک مادہ بھیڑیئے نے دودھ پلا کر پالا تھا اور رومولس نے شہر روم کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس تصویر کے چاروں طرف جو کتبہ ہے اس میں سے صرف اوپر کا حصہ نقل کیا جاتا ہے:-

(۱) ᚱᚠᛗᚨᚠᚴᚨᛋᚺᚴᚷᚷᚱᛗᚨᛗᚨᚠᚴᚨᛋᚺᛏᚹᛟᚷᛗᚷ

(۲) R O M W A L U S . A N D . R E U M W A L U S . T W Œ G E N

جڑواں ریموالس اور رومولس ← (۳)

اسکینڈی نیویا — رونی کتبے ایستادہ پتھروں پر (جن میں سے بیشتر سنگ مزار ہیں) سب ملکوں سے زیادہ سویڈن میں پائے گئے ہیں۔ ان ۲۴۰۰ کتبوں میں سے تقریباً ۲۰۰۰ گیارھویں اور ابتدائی بارھویں صدی عیسوی کے ہیں۔ ناروے سے تقریباً ۲۰ کتبے ملے ہیں جن میں سے ۱۰ اٹھنے ہیں۔ ناروے ہی میں اس خط کا سب سے طویل کتبہ ہے جس کا زمانہ ۱۰۳۰ء ہے۔

---

[1] یہاں کا رونی خط (Manx: Runes) کہلاتا ہے۔ اس کا تعلق اسکینڈی نیویائی خط سے ہے۔ اس کا مشہور ترین کتبہ (Kirk Michael Stone) ہے جس کا زمانہ ۱۱۰۰ء ہے۔

اس پر ۱۷۰ حروف کو اب تک پڑھا جا سکتا ہے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ آئس لینڈ میں جہاں قدیم جرمن ادب سب ملکوں سے زیادہ محفوظ رہا رونی خط کے کتبے بہت کم ملے ہیں ان میں سب سے قدیم سنہ ۱۳۰۰ء کا ہے۔ اسی طرح جنوبی مغربی جرمنی، آسٹریا، بحیرۂ اسود کے روسی ساحل اور رومانیہ میں بھی تھوڑے سے کتبے ملے ہیں۔

ایجاد — رونی خط کی ایجاد کے بارے میں بڑے متضاد نظرئے پیش کئے گئے ہیں۔ مثلاً:- (۱) اُس کا ماخذ سامی خط تھا جو فنیقی تاجروں کے ذریعہ اسکینڈی نیویا پہونچا (۲) وہ اسکینڈی نیویا کے لوگوں کی ذاتی ایجاد تھا۔ (۳) وہ مثل دیگر یورپی رسوم خط اور فنیقی خط کے ایک قبل تاریخی جرمن نارڈک خط سے ماخوذ تھا۔ یہ آخری نظریہ قومی اور سیاسی اغراض کی بنا پر وضع کیا گیا تھا۔ ان نظریوں کی تردید ہو چکی ہے۔

علم الحروف کے نہایت مشہور ماہر ڈاکٹر آئزک ٹیلر (Isaac.Taylor) کے نزدیک رونی خط کو اُن گوتھ لوگوں نے ایجاد کیا تھا جو جنوبی روس میں آباد تھے۔ اُنھوں نے اپنی ایجاد کی بنیاد چھٹی صدی ق۔م کے اُس یونانی خط پر رکھی تھی جو بحیرۂ اسود کی یونانی نوآبادیوں میں مستعمل تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مثل یونانی خط کے قدیم ترین رونی کتبے دائیں سے بائیں کو لکھے گئے ہیں اور یا پھر باری باری اُن کی ایک سطر دائیں سے بائیں کو اور دوسری بائیں سے دائیں کو لکھی گئی ہے، یونانی خط میں پانچ قسم کی تبدیلیوں کے بعد رونی خط وجود میں آیا۔ (۱) غیر ضروری حروف کا ترک کیا جانا (۲) نئے حروف کی ایجاد۔ (۳) حروف کی شکلوں میں تبدیلی۔ (۴) حروف کی آوازوں میں تبدیلی۔ (۵) حروف کی ترتیب میں تبدیلی۔ حروف کی شکلوں میں تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ رونی خط ایک لکڑی پر کندہ کئے جانے والا خط (Xylographic . Script) تھا۔ لکڑی کے ریشوں کے رُخ کی طرف حروف کندہ کئے جاتے تھے۔ اس وجہ سے یونانی حروف کی گولائیوں کی جگہ زاویوں نے لے لی۔ حروف کی ترتیب میں دو وجوہ سے تبدیلیاں ہوئیں۔ یعنی جن حروف کی صورتیں مشابہ تھیں اُنھیں پاس پاس رکھا گیا۔ اس طرح جن کی آوازوں میں تشابہ تھا وہ بھی پاس پاس رکھے گئے۔ اگرچہ ٹیلر کا نظریہ عالموں میں بہت مقبول ہوا لیکن اب اسے تسلیم نہیں کیا جاتا اس لئے کہ رونی خط کا سنہ عیسوی کے آغاز سے قبل موجود ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

بعض عالموں نے سنہ عیسوی کے آغاز سے پہلے کی چند صدیوں کے گھسیٹ یونانی خط کو رونی کا ماخذ بتایا اور اس کارنامہ کو انجام دینے کے لئے کیلٹ لوگوں کو واسطہ ٹھہرایا لیکن ان دعووں کے لئے بھی کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔

ڈنمارک کے عالم (L.Wimmer) کے نزدیک رونی خط کا ماخذ دوسری صدی عیسوی کے اخیر کا لاطینی خط تھا (Argell) کے نزدیک بھی رونی خط لاطینی سے ماخوذ تھا لیکن پہلی صدی عیسوی کے گھسیٹ حروف سے جو پومپیائی کے کھنڈروں پر منقوش ہیں۔ (Von Friesen) کے مطابق رونی خط یونانی اور لاطینی دونوں ہی خطوں پر مبنی ہے "بعض گوتھ افراد — مثلاً کرایر کے سپاہی — بحیرۂ اسود کے شمالی مغربی ساحل سے رومی صوبوں میں گئے اور وہاں اُنھوں نے یونانی اور لاطینی زبانیں اور رسوم خط سیکھے جو سرکاری فرمانوں اور خانگی زندگی میں مستعمل تھے۔ ایسے ہی کسی ایک شخص یا متعدد گوتھ لوگوں نے مل کر گوتھک زبان کو لاطینی اور یونانی خطوں میں لکھنے کی سعی کی ان ہی کوششوں کا نتیجہ رونی خط ہے۔" چنانچہ رونی کے بعض حروف گھسیٹ لاطینی سے مشابہ ہیں، لیکن دوسری باتوں میں وہ یونانی خط سے متاثر معلوم ہوتے ہیں یعنی:-

(۱) دونوں میں حروف کی تعداد ۲۴ ہے جبکہ لاطینی میں کل ۲۱ حروف تھے اور بعد میں جب یونانی کے حروف (ϒ) اور (χ) لئے گئے تو ۲۳ ہو گئے۔ (۲) رونی خط میں حروف نگ کا استعمال یونانی سے لیا گیا جس میں یہ آواز (ϒϒ) سے ظاہر کی جاتی تھی۔ (۳) ہر رونی حرف کا ایک علحدہ نام ہے جو یونانی حروف ایلفا، بیٹا، گاما وغیرہ کی نقل ہے۔ برخلاف

اس کے لاطینی حروف کلاسیکی زمانہ میں اب کی طرح اے، بی، سی، ڈی وغیرہ ہی پڑھے جاتے تھے۔[1]

ڈاکٹر ڈیوڈ ڈرینگر کے نزدیک یہ کل نظرئے ناقابل تسلیم ہیں۔ قدیم رونی خط کی تحریر کا رخ اور حروف کی شکلیں اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ رونی خط کا ماخذ نہ تو گھسیٹ یونانی خط ہے اور نہ گھسیٹ لاطینی۔ ڈرینگر کے نزدیک یہ رائے زیادہ قابلِ قبول ہے کہ رونی خط کا ماخذ شمالی ایٹرسکی خط تھا۔[2] اس نظرئے کو متعدد عالموں نے پیش کیا ہے اور تائید کی ہے جن میں نارووے کے عالم (C.J.S.Marstrander) کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے جس نے فروری ۱۹۲۸ء میں اپنے دعوے کو ثابت کرنے کیلئے ایک تحقیقی رسالہ لکھا تھا۔ علاوہ ازیں (Rhys Carpenter) نے بھی اس نظرئے کی تائید میں اہم دلایل فراہم کئے ہیں

شمالی ایٹرسکی خط کو رونی خط کا ماخذ مان لینے سے لاطینی خط کی اثر اندازی کا امکان بڑھ جاتا ہے اور یہ چیز بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ بعض رونی حروف کی آوازیں ایٹرسکی حروف کی آوازوں سے مشابہ کیوں ہیں۔ مزید براں رونی خط اگرچہ زمانہ کے لحاظ سے بعد کی چیز ہے لیکن حروف کی شکلیں پرانی کیوں نظر آتی ہیں۔ ایٹرسکی خط اور رونی خط میں زمانہ کے لحاظ سے بھی زیادہ فصل نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ دوسری صدی ق۔م یا اس کے کچھ بعد گوتھ لوگوں نے ایٹرسکی خط کا علم حاصل کیا تھا۔ (باقی)

نوٹ :۔ بعض اہم مصروفیتوں کی بنا پر اس سلسلہ کو اسی جگہ روک دینا پڑا۔ اب ایٹرسکی خط، رومن خط اور موجودہ انگریزی حروف کی تفصیلی تاریخ نیز ہندوستانی رو سوم خط کا مفصل تذکرہ سالِ آیندہ پیش کیا جائے گا۔

محمد اسحاق صدیقی

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے چودھویں اڈیشن میں "رونی خط" پر جو مقالہ ہے اُس میں اس نظریہ کو قابلِ قبول قرار دیا گیا ہے۔

[2] اسے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں غیر مقبول بتایا گیا ہے۔

اصلاح و ترمیم :۔ ستمبر کے مضمون میں صفحہ ۳۸ پر "حروف کی تعداد گھٹانے کے لئے غیر ضروری نشانات ترک کئے گئے" مثلاً کے بعد یہ حروف نقل کر لیجئے :۔

ᚷ ᚹ ᛏ ᛚ ᛗ ᛜ ᛞ ᛟ

او د نگ اِ اِہ د گ

اس کے بعد جو حروف نقل کئے گئے ہیں اُن میں اسے اوپر والوں کے سامنے "مقبول" اور نیچے والوں کے سامنے "متروک" لکھ لیجئے۔

"نگار" کی ایجنسی حاصل کرنے کے قواعد

(۱) نگار کے معمولی پرچوں کی قیمت ۱۰ ارفی پرچہ ہے۔ ایجنٹوں سے ۷½ لئے جاتے ہیں، لیکن مصارف رجسٹری بھی انھیں کے ذمے ہوتے ہیں۔ (۲) پانچ پرچوں سے کم کے لئے ایجنسی قایم نہیں کی جاتی اور ایجنٹوں کو ۵ پرچے ذریعہ وی پی پی میں روانہ کئے جاتے ہیں۔ غیر فروخت شدہ پرچے واپس نہیں لئے جاتے — (۳) سالناموں کی قیمت ہر سال مختلف ہوتی ہے۔ جس میں ایجنٹوں کو ۲۵ فی صدی کمیشن دیا جاتا ہے۔ منیجر نگار لکھنؤ

"گاہے گاہے باز خواں ——"

روح و بقاءِ روح کی دلچسپ داستان

انسان کی زندگی اس میں شک نہیں بہت سے معتقدات و مزعومات سے گھری ہوئی ہے اور ہر عقیدہ کے لئے وہ کوئی نہ کوئی دلیل بھی ضرور رکھتا ہے لیکن اگر اُن دلایل کی قوت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سب سے زیادہ کمزور دلیل وہ ہے جو بقاءِ روح کے باب میں اس کی طرف سے پیش کی جاتی ہے۔

قبل اس کے کہ آپ اس دلیل کو سُنیں یہ معلوم کرنا مناسب ہے کہ بقاءِ روح کے معتقدین کہتے کیا ہیں؟

ان میں ایک جماعت تو کہتی ہے کہ صرف روح کو بقا ہے یعنی انسان میں جس چیز کو احساسِ تشخص، حافظہ اور تاثر سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ مرنے کے بعد بھی قائم رہے گا۔ دوسری جماعت جس میں زیادہ تر مذہبی لوگ شامل ہیں وہ بقاءِ روح کے ساتھ حشرِ اجساد کے بھی قایل ہیں، یعنی ایک دن ایسا آئے گا جب جسموں سے جدا ہو جانے والی روحیں پھر اپنے جسموں سے مل جائیں گی اور وہ تقریباً اسی قسم کی زندگی بسر کریں گی جیسی اس دُنیا میں بسر کی ہے،

حیات بعد الموت کا عقیدہ کوئی نیا عقیدہ نہیں ہے بلکہ یہ اتنا ہی قدیم ہے جتنی نوعِ انسانی ۔ اول اول جب انسان کی عقل بہت محدود تھی، تو وہ اپنے مُردہ عزیزوں اور دوستوں کو خواب میں دیکھ کر سمجھتا تھا کہ یہ ضرور کسی نہ کسی حیثیت سے اب بھی موجود ہیں اور انکو پہلے کے ساتھ وہی تعلق باقی ہے جو ان کی زندگی میں پایا جاتا تھا اور یہیں سے یہ اعتقاد پیدا ہوا کہ روح اور جسم دو بالکل علٰحدہ علٰحدہ چیزیں ہیں اور روح جسم سے جدا ہونے کے بعد بھی کسی نہ کسی طرح قایم رہتی ہے، چنانچہ اسی بناء پر ایک شخص کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر کھانے پینے کی چیزیں رکھ دی جاتی تھیں تاکہ اس کو حیات بعد الموت کے طویل سفر میں تشنگی و گرسنگی کی تکلیف نہ پہونچے (مسلمانوں میں مرنے کے بعد فاتحہ وغیرہ کی رسمیں سب اسی اعتقاد کی یادگار ہیں)

خیر اگر عہدِ قدیم کا جاہل انسان ایسا سمجھا جاتا تو جائے حیرت نہیں، کیونکہ وہ غریب حیات کی حقیقت سے واقف ہی نہ تھا، لیکن اب کہ آغازِ حیات کے اسباب سے ہر شخص واقف ہو گیا ہے، روح کے بقا کا قایل ہونا سخت حیرتناک امر ہے۔

حیات حیوانی کی تمام ترقی یافتہ شکلوں کی بنیاد صرف ایک خلیہ یا کویا (CELL) ہے لیکن حقیقتاً حیات کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب اس کا پیوند دوسرے خلیہ سے ہو[1]۔ اس پیوند کے بعد بے شمار خلایا بنتے رہتے ہیں یہاں تک کہ حیوانی صورت ظہور پذیر ہوتی ہے اور ایک وقت معینہ کے بعد وہ اس دُنیا میں قدم رکھتا ہے۔ پھر حیات دنیاوی میں بھی بے شمار خلایا اس کے جسم میں پیدا اور فنا ہوتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ کسی بیماری یا حادثہ یا بڑھاپے کی وجہ سے خلایا کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر مناسب حالات کے تحت خلایا کا پیوند نہ ہو تو وجودِ حیات نہیں پایا جا سکتا۔ یہ درست ہے کہ سب سے پہلا خلیہ جو حیات حیوانی کا باعث ہے خود جان رکھتا ہے، لیکن وہ حیات ایسی نہیں ہوتی جو کسی دوسرے خلیہ سے ملے بغیر ظاہر ہو سکے۔

عورت میں تقریباً دس ہزار پہلی قسم کے خلایا موجود رہتے ہیں اور مرد میں ارب در ارب (بلکہ بیشمار) خلایا دوسری قسم کے پائے جاتے ہیں، لیکن ان میں سے صرف چند خلایا کے پیوند ہونے سے حیات رونما ہوتی ہے۔ پھر اگر ان غیر پیوند شدہ بیکار خلایا میں بھی روح کا وجود مانا جائے

---

[1] نباتات میں عام طور پر کسی دوسرے خلیہ سے پیوند ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ایک ہی خلیہ ترقی پاکر اور اپنے اندر سے کثیر خلایا پیدا کر کے نشو و نما کا باعث ہوتا ہے۔

اور مرنے کے بعد حیات مابعد کی وہی صورت تسلیم کی جائے جو ان غیر نتیجہ خیز خلایا میں پائی جاتی ہے، تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایسی حیات سے کیا فایدہ ہے اور کیوں اس کی تمنا کی جائے ۔

اگر وہ چیز جس کا نام " روح " ہے جسم سے بالکل علٰحدہ کوئی شے ہے تو پھر لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کب کہاں اور کیونکر جسم کے اندر آگئی، جب انسانی وجود عبارت ہے دو بے روح خلایا کے اتصال سے، تو پھر روح ان میں کہاں سے آگئی ۔ اس کا جواب دینا ہمارا فرض نہیں ۔

آپ نے سُنا ہوگا کہ ایک جنین جس نے رحم مادر میں پوری پرورش پائی تھی اور جس میں جان پڑ گئی تھی کسی صدمہ سے بالکل بے جان پیدا ہوا، لیکن بجلی اور دیگر آلات کی مدد سے اس میں جان پھر عود کر آئی اور وہ اپنی طبعی زندگی پوری کر کے مرا، اسی طرح آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ ایک شخص پانی میں ڈوب کر بالکل بے جان ہوگیا۔ لیکن اس میں تنفس دوبارہ پیدا کر دیا گیا۔ پھر اگر روح واقعی جسم سے بالکل علٰحدہ کوئی دوسری چیز ہے تو بتایا جائے کہ اس مردہ جنین اور اس غرق شدہ انسان میں اتنے عرصہ کے لئے روح کہاں چلی گئی تھی اور وہ کیوں ان تدابیر کا انتظار کر رہی تھی جو کہ اگر اختیار نہ کی جاتیں تو پھر روح کے واپس آنے کا امکان نہ تھا۔

کہا جاتا ہے کہ " محض حیات کا وجود، جو روح کے لئے ضروری نہیں، اور نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس چیز کو ہم جسم انسانی میں حیات سے تعبیر کرتے ہیں اسی کا دوسرا نام روح ہے ۔ کیونکہ دیگر ذیحیات مخلوق اور انسان کے درمیان مابہ الامتیاز یہی امر ہے کہ انسان میں روح پائی جاتی ہے اور انمیں نہیں ایک درخت میں " حیات " ہے لیکن روح نہیں، ایک جانور میں " زندگی " ہے لیکن روح نہیں ۔ پھر یہ تو صحیح ہے کہ زندگی کا آغاز ایک خاص وقت سے شروع ہوتا ہے اور اس لئے اس کی انتہا بھی ہونی چاہئے لیکن انسان کا حافظہ اور ادراکِ نفس مرنے کے بعد بھی قایم رہ سکتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے روح کہتے ہیں " ۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ دعویٰ کس حد تک درست ہے ۔ انسان میں وجودِ روح کو تسلیم کرنا اور دیگر مخلوقات کو اس سے محروم سمجھنا ایک ایسی بات ہے جس پر کوئی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی ۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ انسان کی طرح اور ذیحیات اشیاء میں بھی ادراک و حافظہ نہ پایا جائے گھوڑے، کتے اور بلی کا برسوں کے بعد اپنے مالک کو پہچان لینا اس بات کا قوی ثبوت ہے کہ ان میں قوتِ حافظہ بھی پائی جاتی ہے اور ادراک بھی اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ ادراک و حافظہ صرف انسان ہی کو میسر ہوا ہے تو پھر انسان کو اُس وقت کی باتیں کیوں یاد نہیں رہتیں، جب وہ رحمِ مادر میں تھا، یا جب دُنیا میں آنے کے بعد اُس نے گھٹنیوں چلنا سیکھا تھا، اسی طرح ضعیف ہونے کے بعد انسان کیوں اپنے شباب کی بہت سی باتیں بھول جاتا ہے، اس لئے قرینِ قیاس یہی ہے کہ مرنے کے بعد یہ حافظہ و ادراک بھی ختم ہو جائے گا اور جس طرح پیدا ہونے سے پہلے عدم کی تاریکی تھی اسی طرح مرنے کے بعد طاری ہو جائے گی، نہ پہلے کچھ تھا، نہ بعد میں کچھ ہوگا ۔

عہدِ قدیم میں جب انسان نہ اپنے جسم کی تعمیری حقیقت سے واقف تھا اور نہ کائنات کے دوسرے مخلوقات کا اسے علم تھا، اس کا روحوں کے وجود کو جسم سے علٰحدہ سمجھنا ٹھیک تھا کیونکہ آسمانی جغرافیہ کی حقیقت اس کے نزدیک صرف یہ تھی کہ زمین کو آسمان گھیرے ہوئے ہے اور اس میں ستارے جڑے ہوئے ہیں، آسمان کے اوپر بہشت ہے جہاں فرشتے اوپر نیچے آتے جاتے رہتے ہیں ۔ لیکن اب کہ مکان و زمان کا مفہوم بہت وسیع ہو گیا ہے اور ہماری دوربینوں نے کرۂ ارض سے بہت زیادہ عظیم المرتبت اجرام سماوی ہمارے سامنے پیش کر دئے ہیں، ہمارے لئے یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ لامتناہی فضا کے ان بیشمار دنیاؤں میں، صرف کرۂ ارض ہی کے باشندوں کو کوئی خاص اہمیت حاصل ہے اور انھیں کی روحوں کو بقاء دوام کے خلعت سے سرفراز کیا گیا ہے پھر اور کروں کو جانے دیجئے، خود اسی زمین کے تمام مخلوقات کو لیجئے تو بھی سوچنا پڑے گا کہ انسان کی روح کو بقا کیوں حاصل ہو اور جانوروں کی روحیں فنا کر دیجائیں اور اگر اس کا جواب صرف مصلحتِ خداوندی ہو سکتا ہے تو کیا وہی رضاء الٰہی و مصلحتِ ربانی روحِ انسانی کو فنا نہیں کر سکتی، ایسا کرنے سے آسے کون باز رکھ سکتا ہے اور اس میں کونسا استحالۂ عقلی ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد روح عالمِ برزخ میں رہتی ہے بعض کہتے ہیں کہ اسی وقت بہشت و دوزخ کی طرف لیجاتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ عالمِ برزخ یا بہشت و دوزخ ہیں کہاں ؟ ۔ روح کا یہ سفر کیونکر ہوتا ہے اور اپنی منزل تک پہونچنے کے بعد وہ کہاں اور کیونکر رہتی ہے

کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ وہاں عزیزوں اور دوستوں سے بھی ملاقات ہوگی گویا کوئی جگہ ایسی ہے جہاں ان سب کا اجتماع ہوگا اور وہ اسی دُنیا کی طرح آپس میں تبادلۂ خیال کرسکیں گے، اب اسی اعتقاد کے ساتھ ان علمی حقایق کو بھی سامنے رکھئے کہ زمین اپنے محور پر نہایت تیزی سے گردش کر رہی ہے اور ۲۴ گھنٹے میں پوری ایک گردش کرلیتی ہے یعنی فی گھنٹہ ایک ہزار میل کی رفتار سے وہ گھوم رہی ہے۔ اسی کے ساتھ اس کی دوسری گردش آفتاب کے گرد ہے جو تقریباً ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ گردش پورے ایک سال میں پوری ہوتی ہے یعنی فی منٹ ایک ہزار میل کی رفتار سے زیادہ زمین کو آفتاب کے گرد چکر لگانا پڑتا ہے۔ پھر یہ قصہ یہیں ختم نہیں ہوجاتا بلکہ ایک اور تیسری گردش ہمارے نظام شمسی کی ہے جو قطب کے گرد ہوتی رہتی ہے اور چوتھی گردش نظام قطبی کی ہے جو خدا معلوم کتنے نظامہائے شمسی کے ساتھ فضاء کہکشاں میں کسی اور مرکز کے گرد چکر لگا رہی ہے ـــ پھر کیا ان تمام چکروں اور گردشوں میں باشندگان کرۂ ارض کی روحوں کا جسم سے جدا ہوکر باہم گرملنا یا کسی ایک جگہ قرار پانا باور کیا جاسکتا ہے۔

بعض نہایت سخت مذہبی قسم کے لوگ باور کرتے ہیں کہ انسان قیامت کے دن معہ اپنے جسم کے اُٹھایا جائے گا۔ اب سے دو ہزار سال قبل اہلِ فلسطین جب وہ نہ زمین کی حقیقت سے آگاہ تھے نہ کائنات کی وسعت سے، یقین کرتے تھے کہ زمین کی عمر چار ہزار سال کی ہے اور طوفان کے بعد دُنیا کو بسے ہوئے صرف دو ہزار سال کا زمانہ گزرا ہے اور جلد ہی اس کو پھر تباہ ہوجانا ہے۔ لیکن آج یہ امر پایۂ تحقیق کو پہونچ گیا ہے کہ انسان کا وجود کرۂ زمین پر لاکھوں سال سے پایا جاتا ہے اور اس دوران میں دُنیا خدا معلوم کتنی مرتبہ بدل چکی ہے، کم از کم تین چار تو صرف برفیلے دور ایسے آچکے ہیں جنھوں نے زمین کی تمام انسانی آبادی کو یا تو سمندر میں ڈبو کر رکھ دیا یا زمین کے اندر دفن کرکے ختم کر دیا۔ خدا جانے کتنی بار نوعِ انسانی جانوروں کی غذا بن کر ختم ہوئی اور پھر انھیں سے پیدا ہوئی۔ الغرض موجودہ انسان میں معلوم نہیں کتنے گزشتہ انسانوں اور جانوروں کے اجزاء شامل ہیں اس لئے اگر حشرِ اجساد کو تسلیم کیا جائے تو وہ کونسا طریقہ ہوگا جو لاکھوں سال قبل کے انسانوں کے تقسیم شدہ اجزاء کو پھر فراہم کرسکے گا اور اگر میرا حشر ہوا تو کن کن جانوروں، کن کن درختوں اور کن کن انسانوں سے میرے اجزاء فراہم کرکے میرا اصلی جسم طیار کیا جائے گا۔

فطرت کے وہ تمام تغیرات جو انسانی ہیولیٰ میں نشوونما، بیماری، ضعیفی اور موت وغیرہ کی صورتیں اختیار کرتے رہتے ہیں بالکل ایسے ہی ہیں، جیسے ہم ایک جلنے والے کوئلہ میں دیکھتے ہیں۔ آپ انگیٹھی میں کوئلہ ڈال دیتے ہیں اس کا کیا حشر ہوتا ہے ایک حصہ اس کا دھواں بن کر غائب ہوجاتا ہے، ایک حصہ حرارت میں تبدیل ہوکر آپ کے کمرہ کو گرم رکھتا ہے اور کچھ حصہ راکھ بن جاتا ہے۔ بالکل یہی حالت انسان کی سمجھئے۔ فطرت ہر وقت جوڑنے، توڑنے، ملانے اور منتشر کرنے میں مصروف ہے اور قوت و مادہ کو وہ اسی طرح نئی نئی صورتوں میں تبدیل کرتی رہتی ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ انسان جو اسی دنیا، اسی نظام اور اسی مادہ سے متعلق ہے اس عمل سے بچا رہے گا، اگر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے آپ کو غیر فانی سمجھے تو ایک چیونٹی بھی یہی دعویٰ کرسکتی ہے، ایک گھاس کا تنکا بھی یہی کہہ سکتا ہے۔ روح ہم میں بھی ہے اور اُن میں بھی اور اگر ہماری روح کو بقا ہے تو اُن کی روحوں کو بھی ہونا چاہئے۔

زندگی حقیقتاً نام ہے صرف اس توازن کا جو فطرت کی تعمیری و تخریبی دو متضاد قوتوں میں پایا جاتا ہے ـــ فطرت کی تعمیری قوت ہمیں قایم رکھنا چاہتی ہے اور تخریبی قوت مٹانے پر تلی ہوئی ہے، جب تک ان دونوں میں توازن قایم ہے، صحیح و توانا کہلاتے ہیں، لیکن جب رفتہ رفتہ تخریبی قوت غالب آنے لگتی ہے تو ہم ضعیف ہوجاتے ہیں اور جب اس کا بالکل تصرف ہوجاتا ہے تو ہم مرجاتے ہیں، لیکن ہماری موت کے بعد فطرت کا یہ عمل بند نہیں ہوتا بلکہ برابر جاری رہتا ہے، اور ہماری تخریب سے پھر تعمیر شروع ہونے لگتی ہے خواہ وہ تعمیر کیڑوں کی ہو یا نباتات و حیوانات کی، اس لئے اب پھر ہمارے انھیں اجزاء کا فراہم ہوکر یکجا ہونا اور اصلی صورت و شکل سے رونما ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔

حشر و نشر یا بقاء روح کا عقیدہ صرف جذبۂ محبت کی بناء پر پیدا ہوا ہے، جس سے مقصود اپنے آپ کو تسکین پہونچانا ہے، اول اول

جب انسان نے دیکھا کہ اس کے ماں، باپ، اس کے بچے، اس کے بھائی بہن، اس کے سردار اور بزرگ دفعتہً مر گئے، تو اسے سخت صدمہ ہوا اور اسے کسی طرح یقین نہ آیا کہ واقعی ہمیشہ کے لئے فنا ہو گئے ہیں اس کے بعد جب اس نے انھیں خواب میں دیکھا، خواب میں ان سے باتیں بھی کیں تو اس کو اور زیادہ یقین ہو گیا کہ ان کی روحیں موجود ہیں اور ہم سے وہی تعلق محبت کا رکھتی ہیں، پھر یہ عقیدہ برابر اسوقت تک قایم رہا۔ جب تک انسان نے حیات کی حقیقت کو نہیں جانا اور اب بھی انھیں قوموں میں باقی ہے جو اس حقیقت سے ناواقف ہیں یا ناواقف رہنا چاہتی ہیں مگر سوال یہ ہے کہ وہ لوگ جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں، کیا فی الحقیقت انھیں اس کا یقین بھی ہے ممکن ہے وہ اس کا اقرار کریں، لیکن مجھے اس میں کلام ہے ـــــ اس سے قبل میں عقیدہ و یقین کا فرق بتا چکا ہوں اور ثابت کر چکا ہوں کہ تمام وہ عقاید جن کا تعلق مابعد الموت سے ہے وہ سب مزعومات و قیاسات ہیں حقیقت سے انھیں کوئی واسطہ نہیں کیونکہ علم حقیقی کا تعلق صرف ہمارے حواس اور ہمارے ادراک سے ہے یا ان تجربات سے جو بربنائے تواتر محسوسات کا حکم رکھتے ہیں ـــــ اور یہاں ان دونوں میں سے کوئی بات نہیں۔

اچھا اس فلسفیانہ موشگافی کو جانے دیجئے وہ لوگ جو حیات بعد الموت کے قایل ہیں اور حقیقی سکون و آرام کی زندگی اسی کو سمجھتے ہیں ان سے پوچھئے کہ باوجود اس علم کے کہ دنیاوی زندگی ناپائدار و مکلف ہے اور اخروی زندگی ابدی راحت، وہ کیوں یہاں کی زندگی پر جان دیتے ہیں، جب بیمار پڑتے ہیں تو کیوں علاج کرتے ہیں، تپ دق اور سرطان میں مبتلا ہونے کے بعد انھیں موت کا یقین ہوتا ہے لیکن پھر بھی چارہ و علاج ضرور کرتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ انھیں اخروی زندگی کا صرف اعتقاد ہے، یقین نہیں اگر انھیں یقین ہوتا تو وہ ایک لمحہ کے لئے اس دنیا میں رہنا پسند نہ کرتے اور جلد سے جلد اس عالم میں پہونچنے کی کوشش کرتے جہاں بہشت کی راحتیں ہیں، حوروں کی آغوشیں ہیں، بچھڑے ہوئے احباب ہیں، چھوٹے ہوئے اعزہ ہیں، جدا ہو جانے والی اولادیں ہیں اور وہ سب کچھ ہے جو یہاں میسر نہیں آسکتا۔

کہا جاتا ہے کہ مرنے سے ڈر اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے گناہوں کی سزا وہاں ملے گی، میں کہتا ہوں کہ اس خیال میں بھی وہی اعتقاد کام کر رہا ہے جسے یقین سے کوئی واسطہ نہیں۔ کیونکہ اگر واقعی سزا کا یقین ہو تو قیامت تک کوئی گناہ سرزد نہیں ہو سکتا اصل یہ ہے کہ مرنے کے بعد نہ معاصی کی سزا کا یقین ہے اور نہ نیکیوں کی جزا کا ورنہ ممکن نہیں کہ یہاں کسی سے کوئی گناہ سرزد ہو یا اس دنیا میں ہمیشہ رہنے کی تمنا دل میں پائی جائے۔

وہ لوگ جو بقاء روح کے قایل ہیں وہ اپنے عقیدہ کے ثبوت میں امریکہ و مغرب کے ان روحانیین کے بیان کو بھی پیش کرتے ہیں جنھوں نے روحوں سے ہم کلام ہونے کا دعویٰ کیا ہے اس کی نسبت ہم اجمالاً پہلے لکھ چکے ہیں کہ یہ دعوے بالکل جھوٹے ہیں اور ان مدعیان روح و روحانیت نے کس کس طرح لوگوں کو دھوکہ میں مبتلا کیا ہے اور جس چیز کو روحوں کا نامہ و پیام کہا جاتا ہے وہ محض مکر و فریب ہے۔

الغرض مسئلہ روح یا حیات بعد الموت منجملہ ان چند مسائل کے ہے جو صرف انسانی تمنا کی پیداوار ہیں اور ان عقاید سے متعلق ہیں جن کے لئے نہ صرف یہ کہ کوئی عقلی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی بلکہ سراسر اصول فطرت و نظام عالم کے منافی ہیں۔ پس اگر مذاہب عالم کا انحصار صرف معاد یا حیات بعد الموت پر ہے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے، تو اب کوئی امید نہیں کہ وہ عرصہ تک قایم رہ سکیں، کیونکہ جوں جوں مادی و علمی ترقی بڑھتی جا رہی ہے انسان میں خود اعتمادی کی کیفیت زیادہ پیدا ہوتی جاتی ہے اور وہ کسی بات کو محض اس دلیل پر ماننے کے لئے طیار نہیں ہو سکتا کہ اب سے پہلے کے لوگ ایسا کہہ گئے ہیں، لیکن اگر مذاہب کی زندگی کا تعلق کسی ایسے درس اخلاق سے بھی ہو جو اسی دنیا میں کام آنے والا ہے اور اسی عالم میں داعیات تمدن کو پورا کرنے والا ہے تو انکے لئے لازم ہے کہ وہ صرف اسی پر اپنی بنیاد قایم کریں اور ان عقاید پر زور نہ دیں جو ان کی کمزوری کو ظاہر کرنے والے ہیں۔

یہ دور ڈائرکٹری اور مشین کا ہے، ذہنی آزادی اور حکمت عملی کا ہے، محض روایتی معتقدات کا نہیں اور ایک مذہب کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ اس کی بنیاد صرف روایات پر قایم ہے فکر و تدبر پر نہیں، سنی سنائی باتوں پر ہے ذاتی تجربہ و یقین پر نہیں۔

چراغ

(ساقی جاوید - بی - اے)

ہم دیر و حرم کی زینت ہیں تقدیس کدوں میں جلتے ہیں
ہم شام سے لیکر تا بہ سحر عرفاں کی حدوں میں جلتے ہیں

محلوں کے در و دیوار پہ ہم ہر شب کو سحر کر دیتے ہیں
جس بام پہ روشن ہوتے ہیں فردوس نظر کر دیتے ہیں

ہر طاق زر افشاں ہم سے ہے ہر بزم گلستاں ہم سے ہے
تثلیث کدہ ہو یا معبد راتوں میں چراغاں ہم سے ہے

ہم قوسِ قزح کا ترکش ہیں ہم پھولوں کی محراب بھی ہیں
فانوس میں روشن ہوتے ہی ہم زہرہ بھی مہتاب بھی ہیں

جب رقص ہمارا ہوتا ہے بازار دہکنے لگتے ہیں
قلعوں پہ شباب آجاتا ہے مینار دہکنے لگتے ہیں

تاریک زمیں ملبوس بدل کر نخلستاں بن جاتی ہے
جس راہ میں ہم جل جاتے ہیں وہ کاہکشاں بن جاتی ہے

ہم راہروانِ شعلہ نفس کے گرم سفر ہو جانے سے
اک لو سی نکلنے لگتی ہے اس خاک کے ظلمت خانے سے

کس کس کی جبین و عارض کی تشبیہ کے ہم کام آتے ہیں
مہتاب، و نجوم و لالہ کی توجیہہ کے ہم کام آتے ہیں

قسمت کو ہماری کیا کہئے مغموم بھی ہیں مسرور بھی ہیں
راتوں میں کسی کے مرقد پر جلنے کے لئے مجبور بھی ہیں

اشکوں کے دہکتے افسانے آہوں کے سلگتے قصے ہیں
افلاس کدوں کی پارینہ تاریخ کے ہم بھی حصے ہیں

ہم پر بھی رکھے ہے قدرت نے بنیاد کئی افسانوں کی
ہم کو بھی ملی ہے تحفے میں کچھ خاک یہاں پروانوں کی

روتے ہیں نظامِ عالم پر جلتے ہیں دیارِ ہستی میں
ہم آگ لگانے آئے ہیں اے انسانو اس بستی میں

عصمت کے جنازے دیکھے ہیں مذہب کے ہلاکت خانوں میں
اے وقت جلیں گے ہم کب تک تہذیب کے گورستانوں میں

ہم کس سے کہیں یہ افسانے بیدار ابھی انسان نہیں
اس شام و سحر کے قلزم میں صدیوں سے کوئی طوفان نہیں

ہم اہلِ سفر نے دیکھی ہے خوں رنگ تباہی راہوں میں
رو رو کے گزاری ہیں راتیں چنگیز کی خیمہ گاہوں میں

سقراط و مسیح و گوتم کے عہدوں کی دلیلیں باقی ہیں
اس وقت بھی قصرِ ماضی کی خوں رنگ فصیلیں باقی ہیں

محلوں کے سنہرے طاقوں میں جلنے کے لئے رکھ دیتے ہیں
ارباب جہاں افسوس کہاں لے جا کے دئے رکھ دیتے ہیں

ہم تو ہیں دلیلِ راہگزر انساں کو مگر احساس نہیں
دامن پہ ہمارے آنسو ہیں، اس کا بھی کسی کو پاس نہیں

دنیا کے تباہی خانے میں گھبرا کے کہیں جی چھوڑ نہ دیں
اے وقت ترے مہمان کہیں پہلو میں ترے دم توڑ نہ دیں

کچھ اور دکھا دیں راہ تجھے پھر ساتھ کہاں ہم آئیں گے
اک بار بجھے تو اے انساں پھر ہاتھ کہاں ہم آئیں گے

دولتِ برباد

(فضا ابن فیضی)

خانہ آباد ہے ویرانی دیکھ
یہ تباہی کی غزل خوانی دیکھ

اب گریباں بھی نہیں ہاتھ میں
عالمِ بے سر و سامانی دیکھ

زندگی عافیت اسلوب کہاں
خون انساں کا ہوا پانی دیکھ

ابھی طوفان کی نبضیں نہ ٹٹولیں
ساحلوں پر ہے جو طغیانی دیکھ

زخم پہلو سے غریب الوطنی
یہ بہارِ غمِ پنہانی دیکھ

ڈھل گئی قالبِ صرصر میں نسیم
وحشتوں کی یہ فراوانی دیکھ

جو پشیمانِ رفو ہو نہ سکا
چاکِ پیراہنِ انسانی دیکھ

دیکھ ارباب تمدن کی روش
یہ تصوف کی تن آسانی دیکھ

آج پھر مصر کے بازاروں میں
بک گئے یوسفِ کنعانی دیکھ

لٹ گئی عظمتِ احساسِ یقیں
سو گئی قوتِ ایمانی دیکھ

ہر نظر عیش، ہر احساس، گناہ
کفر و تہذیب کی ارزانی دیکھ

جسم کپڑوں میں ہیں ننگے ہیں ضمیر
یہ قبا پوشی و عریانی دیکھ

واعظِ قوم کے پیراہن میں
نہ رہی بوئے مسلمانی دیکھ

نگہ و قلب کا افلاس نہ پوچھ
عقل کا شیوۂ نادانی دیکھ

شانہ کش جذبۂ بیدار نہیں
زلفِ ملت کی پریشانی دیکھ

جلوے محکوم، اندھیرے آزاد
یہ سیہ پوش درخشانی دیکھ

درد کے ساز پہ تنہائی میں
آنسوؤں کی یہ خوش الحانی دیکھ

زندگی چند نفس ہے پھر بھی
کتنی مشکل ہے یہ آسانی دیکھ

خلوتِ ماہ و ثریا کے مکیں،
اشک خونیں کی بھی تابانی دیکھ

تجھ کو پندارِ خدائی کی قسم
اپنی دنیا کی یہ ویرانی دیکھ

بگولوں کی دُلھن

جگیشور ناتھ ورما (بیتاب)

زندگانی کروٹیں لیتی رہی خلجان میں
عہدِ طفلی لے کے انگڑائی جواں ہونے لگا
جب نئی اُٹھتی جوانی پاؤں پھیلانے لگی
بدلیاں زلفوں کی اُمڈیں نور کی پھوٹی کرن
چاندنی پر تھی شرابِ ارغواں موج آفریں
گدگدائی گنگنائی جھومتی آئی ہوا،
گدگدا کر پاؤں چومے عقد کی زنجیر نے
ڈھانپ کر مُنھ گھر سے نکلی نازنیں بیمار سی
یوں گلے مل مل کے دُنیا بھر نے رخصت کر دیا
چل پڑی مُڑ مُڑ کے تکتی دم بخود چیں بر جبیں
مختصر سا قافلہ گو مہ جبیں کے ساتھ تھا
دیکھتے ہی دیکھتے دولھا دُلھن رخصت ہوئے
جیٹھ کی تپتی فضائیں پھول برساتی رہیں
آندھیوں کے گرم جھونکے تھپکیاں دیتے رہے
آگ کے شعلوں پہ مستانہ ادا چلتی رہی
لڑکھڑاتے سے نظر آتے تھے لو دیتے شجر،
کھینچتا تھا دستِ نادیدہ سے دامانِ عروس
جھلملاتا تھا پسینے میں جو کندن سا بدن
آگ کی گرمی سے لپٹی تھی ہوائے تُند خو،
اپنے حلقوں میں لئے پرچم شعاعِ نور کا
دفعتاً ٹھٹکی اُٹھانا پاؤں دوبھر ہو گیا،
جُھک گئیں سمٹی نگاہیں منھ پہ سرخی چھا گئی
اک نئی دنیا اُمنگوں سے لپٹ کر رہ گئی
ہمعناں رخشِ ہوا کا تھما غبارِ آرزو
ہو گئیں طے منزلیں ساری میانِ رہگذر
تشنگی کی آنچ سے مُرجھا گیا نخلِ حیات

کھیلنے کھانے کے دن کہتے رہے کچھ کان میں
چلچلاتی دھوپ کا خنجر رواں ہونے لگا
اک حسین و مست دنیا کیف برسانے لگی
تھا کنار نکہت گل میں اُمنگوں کا چمن،
لے اُڑی رنگِ شفق کی آنچ صندل کی زمیں
مسکراہٹ کے چمن کا غنچہ غنچہ کھل اُٹھا
مسکرا کر سر جُھکایا حُسن کی تصویر نے
کوششیں دل تھامنے کی تھیں مگر بیکار سی
آنسوؤں کے موتیوں سے اس کا دامن بھر دیا
فرشِ مخمل بن گئی جلتی ہوئی چٹیل زمیں
اک ہجومِ شوق نازِ دلنشیں کے ساتھ تھا
دل بدل آویختہ سرو و سمن رخصت ہوئے
آگ سی بیکل ہوائیں دل کو گرماتی رہیں،
دھول کے بادل بلائیں پے بہ پے لیتے رہے
نور کے سانچے میں ڈھلنا تھا اُسے ڈھلتی رہی
بدلیوں سے دھول کی خورشید کے جلتے تھے پر
آندھیوں کا چیختا سر پھوڑتا سرکش جلوس
چاند سے مکھڑے کو گھونگھٹ سے نہ لگتا تھا گہن
لوٹتے پھرتے تھے ذرے پی کے شعلوں کا لہو،
مُنھ چڑاتے تھے بگولے تک شبِ دیجور کا،
چھا گئیں مایوسیاں یا معرکہ سر ہو گیا
رو پسینے کی چلی برسات سر پر آ گئی
کائناتِ رنگ و بو گویا سمٹ کر رہ گئی
یا اُڑی جاتی تھی شیشہ سے شرابِ مشکبو
تلملا کر بچھ گئے جلوے بساطِ خاک پر،
چھا گئی افلاس کی ٹھٹھری ہوئی تاریک رات

میتِ دوشیزگی رکھی تھی بے گور و کفن
یعنی آغوشِ اجل میں تھی بگولوں کی دُلہن

بیانِ آرزو

پروفیسر شورؔ (علیگ)

گستاخیٔ بحضرتِ یزدانم آرزوست
یک سجدۂ خلوص بجانانم آرزوست

در بزمِ دوست ذوقِ غزلخوانم آرزوست
مضرابِ یک نظر بہ رگِ جانم آرزوست

تنہا بخاکِ دیر نیم دانہا بدوش
ہم در حرم شکارِ غزالانم آرزوست

رختے بروں زصدِ گلستانم آرزوست
بر ہر قدم ہزار بیابانم آرزوست

یک گلستاں بہ ہمتِ پروازِ شوق نیست
پروازِ صد ہزار گلستانم آرزوست

بگزر زِ کہکشاں و مکن بر ستارہ ناز
دامے بآفتابِ درخشانم آرزوست

خوردم فریبِ ساحلِ و دیگر نمی خورم
آویزشِ سفینہ و طوفانم آرزوست

اے عشق طرحِ عالمِ نوعے دگر بریز
نے گبرم آرزو نہ مسلمانم آرزوست

دین است اگر ہمیں و گر اینست بندگی
پروردگارِ تو بہ زایمانم آرزوست

در محفلے کہ لاف زشعر و غزل زنند
لختے سکوت و دیدۂ حیرانم آرزوست

اے عشق نالہ سر کن و اے دیدہ خوں ببار
یاراں شدند و صحبتِ یارانم آرزوست

اے شورؔ دم زفتنۂ دیر و حرم مزن
انساں پرستم و غمِ انسانم آرزوست

شباب

(شفیقؔ شاہجہانپوری)

تقوے کی یہ فرسودہ کہانی اچھی
یا جام میں روحِ زندگانی اچھی

صد سالہ و خشک دورِ پیری سے شفیقؔ
اک ساعتِ پرکیفِ جوانی اچھی

لبریزِ سرور و کامرانی تو ہے
معمورِ شرابِ ارغوانی تو ہے

یہ رات جسے کہتے ہیں سب عہدِ شباب
تاریک سہی مگر سہانی تو ہے

تو سرِّ مشیت سے نہیں ہے آگاہ
ہم رازِ حقیقت ہے کہاں تیری نگاہ

تقوے کے پرستار خبر بھی ہے تجھے
ناکردہ گناہی ہے جوانی میں گناہ

پایانِ نشاط و کامرانی ہے شباب
تکمیلِ متاعِ زندگانی ہے شباب

اے شیخ کہن سال تجھے کیا معلوم
جنت کی حیاتِ جاودانی ہے شباب

گہوارۂ سرمستی و عشرت ہے شباب
اس عالمِ رنگ و بو کی جنت ہے شباب

مرجھائے ہوئے پھول نے غنچوں سے کہا
دو دن ہی سہی پھر بھی غنیمت ہے شباب

ہستی میں اک انقلاب ہو جائے گا
پامال ترا شباب ہو جائے گا

یہ موسمِ پرکیف یہ دورِ رنگیں
اک روز خیال و خواب ہو جائے گا

روش صدیقی :

بغل میں ایک شکستہ سا جام رکھتے ہیں
ہم اہتمامِ نشاطِ دوام رکھتے ہیں

جگہ ملی نہ زمانے میں سر چھپانے کی
مگر بتائیں کہاں ہم قیام رکھتے ہیں

پڑے غنی ہیں گدایانِ وعدۂ فردا
ہزار سلسلۂ صبح و شام رکھتے ہیں

قدم، قدم، پہ محبت کے خانماں برباد
بنائے قصرِ حیاتِ دوام رکھتے ہیں

بہ قیدِ بادہ و ساغر کسے نصیب ہوئی
وہ سرخوشی جو ترے تشنہ کام رکھتے ہیں

بجھے تو بجھ نہ سکیں گے، کہ تیرے پروانے
وہ دلیعتِ تپشِ ناتمام رکھتے ہیں

گزر کے اہلِ طلب سے ادھر بھی ایک نظر
ہم اہلِ ترک بھی کچھ تجھ سے کام رکھتے ہیں

روش! گلہ ہے فقیہانِ شہر کو ہم سے
ہم اہلِ درد یہاں کیوں قیام رکھتے ہیں

سیف حسن پوری :-

رنگِ امید نقشِ تمنا میں بھر گئی
اللہ! کیا غضب نگہِ ناز کر گئی

بے کیفیٔ حیات، اور اُس پر غمِ حبیب
اُف! جانِ ناتواں پہ قیامت گزر گئی

یونہی سہی، ہوا تو مداوائے اضطراب
ہاں اے ہجومِ یاس! طبیعت ٹھہر گئی

یادش بخیر! کیا نگہِ التفات تھی
اک نامرادِ زیست کی دُنیا بدل گئی

نوکِ مژہ پہ آہی گیا سیف رازِ دل
آج اُس کی یاد پردۂ غم خاک کر گئی!

نورجہاں نصرت :-

نہ رہا وہ زورِ طوفاں، نہ وہ تند و تیز دھارے
بڑھا جب مرا سفینہ، اُبھر آئے خود کنارے

میں جلا کے آشیاں کو سوئے دشت کیوں نہ ہولوں
کہ فلک سے ہو رہے ہیں یہی برق کے اشارے!

میں کشاکشِ غمِ دل سے نجات پاؤں کیونکر
کبھی تیری یاد روکے کبھی زندگی پکارے!

ہے جنوں ہمارا رہبر، ہمیں کیا ملال نصرت
جو چراغِ راہِ گل ہوں، جو بجھیں فلک کے تارے!!

اکرم دھولیوی :-

اب تری حسرتِ دیدار سے جی ڈرتا ہے
حیرتِ نقشِ بدیوار سے جی ڈرتا ہے

شرکتِ انجمنِ ناز کی حسرت تھی کبھی
اب ترے سایۂ دیوار سے جی ڈرتا ہے

اُن کے آگے نہ کہیں چھیڑ دے رودادِ الم
بزمِ عشرت میں دلِ زار سے جی ڈرتا ہے

آتشِ گل نے جلائے ہیں نشیمن لاکھوں
کس قدر شعلۂ رخسار سے جی ڈرتا ہے

لگتی ہے خار کو دامن سے اُلجھتے کیا دیر
آرزوئے گل و گلزار سے جی ڈرتا ہے

دَور ایسا بھی گزرتا ہے کبھی وحشت میں
دشت تو دشت چمن زار سے جی ڈرتا ہے

شفقت کاظمی (بہ طرزِ حسرت) :

ترے حضور میں کیوں بار پا نہیں سکتا
وہ بدنصیب جو تجھ کو بھلا نہیں سکتا

تری نگاہِ کرم کی امید کیوں رکھے
وہ دل کہ بارِ تغافل اُٹھا نہیں سکتا

ہوئے ہیں مر کے محبت میں زندۂ جاوید
زمانہ دل سے ہمیں اب بھلا نہیں سکتا

مطبوعات موصولہ

کتاب نورس

دکن کے عادل شاہی خاندان میں ابراہیم عادل شاہ ثانی بڑا جلیل القدر فرمانروا تھا اور علم و فضل کا بڑا قدر شناس۔ اس کا دربار ادیبوں اور شاعروں کا مرکز تھا، چنانچہ ظہوری اسی دربار کا ملک الشعراء تھا۔ خود ابراہیم عادل شاہ بڑا پڑھا لکھا شخص تھا اور علاوہ علوم متداولہ کے موسیقی سے بھی خاص لگاؤ رکھتا تھا اور اسی ذوق کا نتیجہ کتاب نورس تھی۔ اس کتاب میں اس نے موسیقی پر فنی بحث نہیں کی ہے بلکہ مختلف راگوں کو سامنے رکھ کر ۶۰ گیت اردو ہے اس وقت کی دکنی زبان تصنیف کئے ہیں۔

اسی کتاب کو ڈاکٹر نذیر احمد (لکھنؤ یونیورسٹی) نے ایڈٹ کرکے کتاب نورس کے نام سے شایع کیا ہے۔ اصلی تصنیف بہت مختصر ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنی تحقیق و ریسرچ سے اسے ایک اچھی خاصی کتاب بنا دیا ہے۔ انھوں نے ہندوستان کے مختلف کتب خانوں سے اس کے نسخے جمع کرکے اس کی صحت کی، اعراب لگائے اور ترجمہ کیا، اسی کے ساتھ انھوں نے ایک بسیط مقدمہ لکھکر اس عہد کی گویا مختصر سی ادبی تاریخ بھی مرتب کردی جو ابراہیم عادل شاہ کے ماحول اور خود اس کے علمی ذوق سے پیدا ہوئی تھی۔ مقدمہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اس کی ترتیب و تدوین میں کتنی محنت، کتنی کاوش اور کتنی ژرف نگاہی سے کام لیا ہے۔

یہ کتاب دو روپیہ آٹھ آنے میں مکتبۂ دانش محل لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

صحیفۂ ہمام بن منبہ

حیدرآباد میں عرصہ سے ایک ادارہ قایم ہے جو مسلمانوں کی قدیم مذہبی تصانیف کی اشاعت کرتا رہتا ہے۔ اس ادارہ کے روح رواں ڈاکٹر حمید اللہ ہیں جو اس وقت تک مختلف زبانوں میں متعدد کتابیں قدیم اسلامی تمدن پر تصنیف کر چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی انھیں کی تدوین و ترتیب کا نتیجہ ہے۔

"ہمام بن منبہ" مشہور جامع احادیث حضرت ابوہریرہ کے شاگرد تھے اور انھیں کے لئے ایک مجموعہ ۱۳۸ احادیث نبوی کا حضرت ابوہریرہ نے ۵۸ھ سے پہلے املا کرایا تھا، جو کمیاب تھا۔ ظاہر ہے کہ جو مجموعۂ احادیث ۵۸ھ سے پہلے مرتب ہوا ہوگا اور جسکے ترتیب دینے والے حضرت ابوہریرہ ہوں گے وہ بڑی مقدس چیز ہوگا، لیکن قبل اس کے کہ ان احادیث کو صحیح تسلیم کیا جائے، جامع احادیث کی حیثیت سے خود جناب ابوہریرہ کی اہمیت کا سوال سامنے آتا ہے۔

ابوہریرہ ۷ھ میں مدینہ آئے اور رسول اللہ کے صحابی ہونے کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہنے لگے، اس لئے ظاہر ہے کہ ان کو رسول اللہ کے اقوال و افعال کا بہت زیادہ علم ہوگا، لیکن سوال یہ ہے کہ ۵۰۰ ۳ احادیث جو ان سے منسوب کی جاتی ہیں، ان میں واقعی کتنی ان کی روایت کی ہوئی ہیں اور کتنی الحاقی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کا حافظہ بہت قوی ہو، لیکن محض حافظہ کی قوت اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ تمام احادیث جو ان سے منسوب کی جاتی ہیں واقعی انھیں کی بیان کی ہوئی ہیں۔ علاوہ اس کے یوں بھی ان کے مزاج میں ظرافت زیادہ تھی اور اسی بنا پر بعض نقادان احادیث نے ان کی روایات پر نقد و جرح کی ضرورت سمجھی اور ابوہریرہ کو اس کی تردید کرنا پڑی۔

بہرحال ابوہریرہ، جامع احادیث کی حیثیت سے اتنا بلند مرتبہ نہ رکھتے تھے کہ ان کی تمام احادیث کو بغیر نقد و جرح کے صحیح باور کیا جائے یا یہ کہ تمام ان احادیث کو جو ان سے منسوب کی جاتی ہیں واقعی انھیں کی روایت تسلیم کر لیا جائے۔ چنانچہ اس بات کا

ثبوت ہمیں "صحیفۂ ہمام بن منبہ" سے بھی ملتا ہے جس میں بعض احادیث ہم کو نہایت عجیب و غریب نظر آتی ہیں مثلاً :-

(۱) رسول اللہ نے فرمایا کہ جنت میں ایک درخت ہے اگر سوار اس کے سایہ میں سو برس تک چلتا رہے تو بھی اس کو ختم نہ کرے گا۔

(۲) قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک آفتاب اپنے مغرب سے نہ نکلے۔

(۳) خدا کا عرش پانی پر ہے اور اس کے دوسرے ہاتھ میں روک لینے کی قابلیت ہے وہی بلند کرتا ہے اور وہی پست کرتا ہے۔

(۴) اللہ نے آدم کو اپنی شکل پر بنایا، ان کی لمبائی ۶۰ ہاتھ تھی۔ اور ہر وہ شخص جو جنت میں داخل ہوگا اس کی لمبائی ۶۰ ہاتھ ہوگی۔

(۵) پہلی جماعت جو جنت میں داخل ہوگی ان کی صورتیں چودھویں رات کے چاند کے مانند ہوں گی، جنت میں وہ نہ تھوکیں گے، نہ ناک صاف کریں گے اور نہ بیت الخلا جائیں گے، ان کے برتن اور کنگھے سونے چاندی کے ہوں گے، ان کی انگیٹھیاں ایلوے کی ہوں گی اور ان کا چھڑکاؤ مشک کا ہوگا، ان میں سے ہر ایک کے دو بیویاں ہوں گی، جن کی پنڈلیوں کا گودا حسن کی وجہ سے گوشت کے اندر سے نظر آئے گا۔

(۶) خضر کا نام خضر (سبز) اس لئے رکھا گیا کہ ایک مرتبہ وہ ریت پر بیٹھے تو وہ سرسبز ہوگئی۔

اس قسم کی تمام احادیث جو تاریخ، مابعد الطبیعی عقاید یا پیش گوئیوں سے تعلق رکھتی ہیں اکثر و بیشتر موضوع ہیں اور اس وقت ضرورت ہے کہ درایتی نقطۂ نظر سے چھان بین کرکے اس طرح کی تمام احادیث کو ساقط الاعتبار قرار دیا جائے نہ کہ ان کی تصدیق

اس میں شک نہیں کہ صحیفۂ ہمام تاریخی حیثیت سے بڑی اہم چیز ہے، لیکن مذہبی حیثیت سے اس کی اہمیت بعض احادیث کی وجہ سے بہت کم ہو جاتی ہے۔ ضرورت تھی کہ کتاب کے مقدمہ میں اس خاص پہلو پر ناقدانہ بحث کی جاتی۔

اس کتاب کا اہم ترین حصہ ڈاکٹر صاحب موصوف کا مقدمہ ہے جس میں انھوں نے نہ صرف ایک محقق کی حیثیت سے صحیفۂ ہمام پر روشنی ڈالی ہے بلکہ یہ بھی نہایت وضاحت کے ساتھ ظاہر کیا ہے کہ ابتداء عہد اسلام ہی میں تحصیلِ علم و اصلاحِ تمدن کی طرف توجہ شروع ہوگئی تھی اور تدوین حدیث کی ابتدا عہد نبوی ہی میں ہوگئی تھی۔

یہ کتاب ہے میں الہدیٰ بک ایجنسی نظام شاہی روڈ حیدرآباد سے مل سکتی ہے۔

دافع البہتان تصنیف ہے مولوی حسن علی سارنگ پوری استاد جامعۂ سیفیہ سورت کی جس میں انھوں نے ڈاکٹر زاہد علی کی کتاب "تاریخ فاطمیین مصر" پر تبصرہ کرکے ثابت کرنا چاہا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی کتاب اغلاط و وسائس سے پُر ہے اور صریح تعصب کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری، لیکن اگر مصنف دافع البہتان کے اقتباسات صحیح ہیں اور صحیح نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ واقعی ڈاکٹر صاحب نے مورخانہ دیانت سے کام نہیں لیا اور واقعات کی تحقیق میں بھی پوری کاوش صرف نہیں کی ہے۔

تاریخ کی کتاب لکھنے میں، مذہب کا کوئی سوال سامنے نہ آنا چاہئے بلکہ صحت تاریخی کا لحاظ رکھنا چاہئے اور اگر ڈاکٹر صاحب نے اس کا لحاظ نہیں رکھا جیسا کہ کتاب زیرِ نظر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے تو انھوں نے واقعی کوئی اچھی تاریخی خدمت انجام نہیں دی۔

یہ کتاب تقریباً ۸۰۰ صفحات کو محیط ہے، لیکن اس طوالت کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ قدیم مناظرانہ انداز میں لکھی گئی ہے، ورنہ تمام باتیں دو تین سو صفحات میں آسکتی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ مصنف نے اس کتاب کی تالیف میں بڑی محنت کی ہے اور اس کے مطالعہ سے بہت سے وہ پردے بھی اٹھ جاتے ہیں جو فاطمیین مصر کی تاریخ پر پڑے ہوئے تھے۔

اس کی قیمت بہت کم صرف چار روپیہ رکھی گئی ہے اور داؤدی بوہرہ بک ڈپو ۱۷۶ مسجد بندر روڈ بمبئی سے مل سکتی ہے کاغذ بہت دبیز استعمال کیا گیا ہے اور کتابت و طباعت بہت واضح و روشن ہے۔

انگاروں کے گیت

مجموعہ ہے جناب حسن شہیر کی نظموں کا جسے کتابستان الہ آباد نے شایع کیا ہے۔ شہیر صاحب ترقی پسند عوامی ادب کے خادموں میں سے ہیں اور وہ اپنے اصول پر خواہ شاعری سے متعلق ہوں یا موضوع شاعری سے، سختی سے قایم ہیں، یہاں تک کہ ہم اگر انھیں ULTRA-MODERN شاعر سمجھ کر اپنی قوت نقد و نظر کی نارسائی ظاہر کرنے پر مجبور ہوں، تو یہ کوئی غلط بات نہ ہوگی۔ ایسے ترقی یافتہ شاعروں کے جذبات اور ان کی شاعری ٹکنک دونوں کی صحیح داد دینے کے لئے ضرورت ہے کہ ہم تمام پچھلے اقدار کو پسِ پشت ڈال دیں اور یہ کوئی آسان بات نہیں۔

حسن شہیر اس میں شک نہیں بہت ذہین انسان ہیں، اتنے ذہین کہ اگر وہ اپنے آپ پر قابو پانا سیکھ جائیں تو وہ شاعر سے بڑھکر لیڈر بھی ہو سکتے ہیں۔

اس مجموعہ میں ان کی اکثر نظمیں آزاد و معرا ہیں اور انداز بیان کی سہما دینے والی ندرتوں سے معمور، اس لئے ضرورت ہے کہ ان کا مطالعہ کیا جائے اور یہ جان کر کہ اگر اسی شاعری کا چلن دنیا میں ہونا ہے، تو کیوں نہ ابھی سے شہیر صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر کے مستقبل کے خدشات سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا جائے۔ قیمت ڈھائی روپیہ۔

حضرتِ عیسیٰ اور عیسائیت

سری نگر میں ایک انجمن اشاعتِ اسلام قایم ہے جو مناظرانہ قسم کا لٹریچر اکثر شایع کرتی رہتی ہے۔ یہ کتاب اس ادارہ سے شایع ہوئی ہے جو ڈاکٹر عزیز احمد قریشی اور جناب عزیز کاشمیری کی متحدہ کاوش کا نتیجہ ہے۔

اس کتاب میں مسیح کی ولادت و وفات وغیرہ کے متعلق تمام مشہور روایات پر بڑی دلچسپ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور پھر یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ کسی وقت کشمیر بنی اسرائیل کا مسکن تھا۔ حضرت عیسیٰ، فلسطین سے ہجرت کر کے یہیں آ گئے تھے۔ وہ ٹیکسلا بھی جاتے تھے جو اس وقت علوم و فنون کا مرکز تھا اور ہندوستان کے برہمنوں اور بودھ پجاریوں سے کسب فیض کرتے تھے۔ آپ کی والدہ حضرت مریم کی قبر مری میں اب تک موجود ہے اور انھیں کے نام پر اس پہاڑ کا نام کوہ مری مشہور ہوا۔ خود حضرت عیسیٰ کی وفات بھی سرینگر میں ہوئی اور ان کا روضہ اب تک موجود ہے۔

یہ اور اسی قسم کی دوسری دلچسپ معلومات اس کتاب میں جمع کر دی گئی ہیں۔ پھر یہی نہیں کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ محض خواب و خیال کی باتیں نہیں بلکہ اس کا ثبوت بھی قدیم لٹریچر سے پیش کیا گیا ہے۔ الغرض کتاب بہت دلچسپ ہے اور پڑھنے کے قابل۔ انجمن اشاعتِ اسلام، قلمدان پورہ سرینگر (کشمیر) سے دو روپیہ میں مل سکتی ہے۔

انتخاب کلام امیر مینائی عاشقانہ

جناب خالد مینائی ام-اے نے ۲۲ صفحات کے مختصر سے رسالہ میں امیر مینائی کے عاشقانہ کلام کا انتخاب شایع کیا ہے جو آٹھ آنے میں مکتبۂ الحبیب اچھرہ لاہور سے مل سکتا ہے۔ نظر انتخاب ہر شخص کی جدا جدا ہوتی ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ ہم کو بعض اشعار کے انتخاب پر اعتراض ہو، لیکن حیرت تو یہ ہے کہ اس مجموعہ میں ان اشعار کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا جو صنمخانۂ عشق کے اخیر میں درج ہیں، حالانکہ ان میں سے اکثر صحیح عاشقانہ رنگ کے ہیں۔ امید ہے آیندہ اشاعت میں اس فروگزاشت کی تلافی کر دی جائے گی۔

انتخاب کلام امیر مینائی نعتیہ

یہ انتخاب بھی جناب خالد مینائی نے کیا ہے اور اپنے مفہوم کے لحاظ سے یقیناً نعت ہی سمجھا جائے گا۔ امیر مرحوم گو شاعر نہ تھے لیکن بربنائے جذبات انھوں نے دیار حبیب کا بھی ذکر کبھی کبھی کیا ہے گو اس میں وہ والہانہ کیفیت نہیں ہے جو شہیدی وغیرہ کے نعت میں پائی جاتی ہے۔ اگر اس سے قطع نظر صرف شاعری کو سامنے رکھا جائے تو بھی یہ انتخاب بہت ناقص دلنشیں ہے۔ اس کی قیمت بھی آٹھ آنے ہے۔

مکتوباتِ نیاز

(تین حصوں میں)

ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، ان اڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر طبع ہوئی ہے، قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ (علاوہ محصول)

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے مُلک کے ہادیان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سُم قاتل ہے، زبان، پلاٹ انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول)

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اس قدر اندیچیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی، تازہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط، قیمت بارہ آنہ (علاوہ محصول)

مالہ وما علیہ

حضرت نیاز نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ فن شاعری کس قدر مشکل فن ہے اور اس میدان میں بڑے بڑے شاعروں نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں، اور اس کا ثبوت اُنھوں نے دورِ حاضر کے بعض اکابر شعراء مثلاً جوش، جگر، سیماب وغیرہ کے کلام کو سامنے رکھ کر پیش کیا ہے۔ ملک کے نوجوان شاعروں کے لیے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے، قیمت دو روپیہ

شہاب کی سرگذشت

حضرت نیاز کا وہ صدیم المثال افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے، اس کی زبان، تخیل، اس کی نزاکت بیان، اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے، یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔ قیمت دو روپے عا/ (علاوہ محصول)

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس رسالہ کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ جدید ایڈیشن ہے جس میں صحت و نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں اُنھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دُنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا، اسکے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے، قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے، ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر، فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اُردو شاعری پر تاریخی تبصرہ، اُردو غزل گوئی پر عہد بہ عہد ترقی، نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد، فنون ادبیہ و حقیقت نگاری، قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

فراست الید

اسکے مطالعہ سے ہر ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی پر پیشینگوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مینجر نگار لکھنؤ

REGD.N.A-466

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۲۸ء

(مومن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شایع کیا گیا ہے، مومن کے مطالعہ کے لیے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپے ۸/

جنوری ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول،

فروری۔ مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم و ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔ قیمت دو روپیہ ۸/ (علاوہ محصول)

جنوری۔ فروری ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں کو نہ بھول جائیے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

جنوری۔ فروری ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شایع کیے گئے ہیں اس سال نامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اصول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہیئے۔ قیمت دو روپیہ (علاوہ محصول)

جنوری۔ فروری ۱۹۵۱ء

اس سالنامے کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں "ارس ہنڈی" کی مشہور عالم کتاب ایک مستقبل کی تلاش کا ترجمہ اقتباس ہے۔ جس میں اس نے ایران، مصر، عراق، فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ ایڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپے ۸/ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۲ء / حسرت نمبر

جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے، قیمت دو روپے ۸/ (علاوہ محصول)

جنوری، فروری ۱۹۵۳ء

(داغ نمبر) جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کیے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے۔ اس نمبر میں قیام رامپور، حیدرآباد کے زمانہ کے علاوہ انکی حیات عشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے فن شعر گوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ قیمت دو روپے ۸/ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۴ء

(فرماں روایان اسلام نمبر) یہ تاریخ اسلامی کا نچوڑ ہے جس میں ولادت نبوی سے لیکر اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے شجرے دے کر ان کے عروج و زوال کو بتایا گیا ہے۔ یہ سالنامہ دراصل تاریخی کتاب ہے جو ہر پڑھے لکھے کے پاس ہونا چاہیئے۔ قیمت تین روپے سکے (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۵ء

(علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر) مع تتمہ۔ جس میں اسلامی علوم و فنون پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مسلم حکومتوں نے علوم و فنون کی ترقی میں کیا حصہ لیا۔ اس کے علاوہ تمام ممالک اسلامیہ کے اکابر علم و ادب کے مختصر حالات و سکران کی علمی خدمات اور تصانیف کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ ہے (علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ